دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

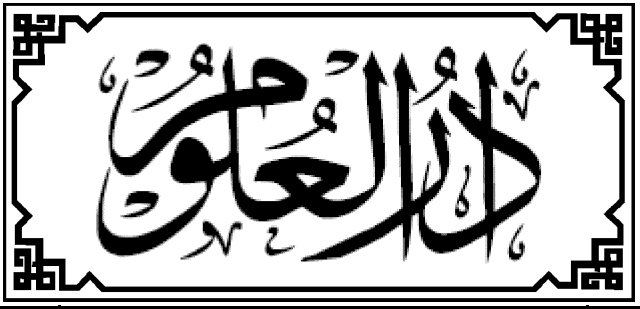

جلد: ۹۳-۹۲	ذی الحجہ ۱۴۲۹ھ-محرم ۱۴۳۰ھ مطابق دسمبر ۲۰۰۸ء - جنوری ۲۰۰۹ء	شمارہ: ۱۲-۱

نگراں	مدیر
حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند	حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند-۲۴۷۵۵۴ یوپی

ہندوستان سے فی شمارہ-/۱۵ روپئے، سالانہ-/۱۵۰ روپئے

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ-/۱۱۰۰ روپئے

بنگلہ دیش سے سالانہ-/۵۰۰ روپئے، پاکستان سے ہندوستانی رقم-/۵۰۰ روپئے

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Mob. : 09411649303 *(Manager)*
Web : http://www.darululoom-deoband.com
www.darululoom-deoband.com/urdu/magazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

R. N. I. No. 2133/57

DARUL ULOOM Monthly (Urdu) Printed, Published by Maulana Marghubur Rahman, Owned by Darul Uloom Grush. Published From Deoband, Saharanpur, U.P. Printed at Darul Uloom Printing Press Deoband, Saharanpur
Editor : Maulana Habibur Rahman Azmi

فہرست مضامین

نمبر شمار	نگارش	نگارش نگار	صفحہ
۱	حرفِ آغاز	حبیب الرحمٰن اعظمی	۳
۲	اسلام میں دیگر اقوام اور اہل مذاہب کے ساتھ رواداری	مولانا شوکت علی قاسمی بستوی	۶
۳	ہندوستان میں اشاعت اسلام سے متعلق اعتراضات کا جائزہ	ڈاکٹر (مفتی) محمد شمیم اختر قاسمی	۱۷
۴	یار غار، لمحات زندگی	محبوب فروغ احمد قاسمی	۵۲
۵	ذہانت، منزلِ حکمت کی جانب گامزن ہوجائے	عزیز بلگامی	۷۲
۶	مصلح کے بھیس میں مفسد ملکی اور عالمی ''پروہت''	ڈاکٹر اجمل فاروقی	۶۸
۷	تحقیق الکلام فی بیان السبب لوجوب الاحکام	رشید احمد فریدی	۸۲

ختم خریداری کی اطلاع

○ یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔

- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- چونکہ رجسٹری فیس میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اس لیے وی پی میں صرفہ زائد ہوگا۔
- پاکستانی حضرات جناب مولانا شیر محمد صاحب ناظم جامعہ مدنیہ، کریم پارک، راوی روڈ، لاہور کو اپنا چندہ روانہ کریں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

حبیب الرحمٰن اعظمی

دارالعلوم دیوبند ایک تعلیمی دینی ادارہ ہے جو لگ بھگ ڈیڑھ صدی سے انتہائی اخلاص اور جانسوزی سے اسلامی علوم وثقافت کی تعلیم وترویج میں مصروف عمل ہے، جس کے نفع بخش ثمرات کے نتیجہ میں رجالِ کار کی ایسی عظیم باکمال جماعت منصۂ شہود میں نمایاں ہوئی جس کی ہمہ جہت عالمگیر خدمات نے چہار دانگ عالم میں دارالعلوم کے نام وکام کو روشن کردیا اور آج دارالعلوم عالم اسلام ہی کا نہیں بلکہ ساری متمدن ومہذب دنیا کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور عقیدت کا مرکز بنا ہوا ہے، ایشیا، افریقہ، یورپ، امریکہ غرضیکہ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ملے گا جہاں دارالعلوم کے شناسا اور عقیدت کیش نہ ہوں۔

دارالعلوم دیوبند کی تاریخ خدمات کا ایک سنہری باب یہ بھی ہے کہ اس نے ''الدین الخالص'' کی سرحدوں کی نگہبانی اور حفاظت کا فریضہ بڑی چابک دستی اور پامردی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ اسلامی آثار وروایات کے خلاف جب بھی کسی فتنہ نے سر اٹھایا تو دارالعلوم کے ساختہ و پرداختہ علماء نے علم وحکمت کے ہاتھوں اس کو کچل دیا، اور دین اسلام کو خارجی اثرات کی دخل اندازیوں سے محفوظ رکھا۔

علاوہ ازیں علم ودین سے وابستہ دارالعلوم دیوبند کے اکابر وابناء نے وطن عزیز کو سامراج کے پنجۂ استبداد سے نجات دلانے اور ملک کی پیشانی سے داغِ غلامی کو مٹانے کے لئے ایثار و قربانی کی ایک ایسی عظیم تاریخ رقم کی ہے جس کے تذکرہ کے بغیر جنگِ حریت کی داستان مکمل نہیں ہوسکتی ہے۔ جذبۂ حریت سے سرشار علماء وفضلاء کی یہی وہ حوصلہ مند جماعت ہے جس

نے سب سے پہلے مکمل انقلاب اور آزادئ کامل کا نعرہ بلند کیا، اور تاریخ گواہ ہے کہ ان کے اس جذبہ کی تپش کو مالٹا کی برفیلی فضائیں اور کالے پانی کی مرطوب ہوائیں بھی سرد نہیں کرسکیں۔ قید وبند، جبر وتشدد، ظلم و جارحیت اور خانماں بربادی وغیرہ سے بے نیاز ہوکر اپنے متعین ہدف کے لئے سرگرم عمل رہے اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے جب تک کہ ملک آزاد نہیں ہوگیا۔

علمائے دیوبند کو اس حقیقت کا مکمل ادراک ہے کہ ایک ایسا ملک جہاں بھانت بھانت کی زبانیں بولی جاتی ہیں، جس کی کھلی اور وسیع فضاؤں میں ان گنت تہذیبیں سانس لے رہی ہیں، جس میں مختلف مذاہب سے متعلق لوگ دوش بدوش زندگی کے مراحل طے کررہے ہیں، وہاں وہی نظام حکومت ملک اور اہل ملک کے لئے مفید اور بارآور ہوسکتا ہے جو جمہوریت اور سیکولرزم کی بنیادوں پر قائم ہو، کہ حکومت بحیثیت حکومت کے کسی مذہب سے نفیاً واثباتاً دلچسپی نہیں لے گی بلکہ ہر مذہب کے ماننے والے امن عامہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے خود اپنے مذہب کے تحفظ وفروغ کے ذمہ دار ہوں گے، اس لئے انھوں نے ہر قسم کی مخالف آواز کو نظر انداز کرکے آزاد ہندوستان میں دستوری اعتبار سے رائج سیکولر اور جمہوری نظام حکومت ہی کو ترجیح دیا اور مذہب و ملت کی تفریق کے بغیر ہر قسم کی فرقہ پرستی کو مسترد کرکے ملک میں سیکولر اقدار کو استوار اور مستحکم کرنے میں پوری مستعدی سے کوشاں ہیں، اپنی اسی فکری ترجیح کی بناء پر مجموعی طور پر ہمیشہ سے ان کی وابستگی ملک کی انھیں سیاسی پارٹیوں سے رہی ہے جو اپنے آپ کو سیکولر کہتی ہیں اور اسی حیثیت سے وہ ملک میں معروف اور جانی پہچانی جاتی ہیں۔

فرقہ پرستی اور اس کے نتیجہ میں دوسروں پر ظلم وزیادتی، جارحیت و دہشت گردی وغیرہ سے نفرت وبیزاری ان کا عام شیوہ ہے، اسی لئے بغیر کسی تفریق کے فرقہ پرست افراد، جماعت، تنظیموں اور پارٹیوں سے ان کا کبھی کوئی تعلق اور رشتہ نہیں رہا ہے، ان کے فکر وعمل کا یہ اعتدال عالم آشکارا ہے، جس کا اظہار وہ حسب موقع وقتاً فوقتاً اپنی تقریروں وتحریروں کے ذریعہ کرتے بھی رہتے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند اور اس سے وابستہ مدارس وعلماء کا یہی علمی، دینی، سیاسی کردار دین بیزار اور فرقہ پرست عناصر کے لئے سوہان روح بنا ہوا ہے، وہ اپنی بددینی اور فرقہ پرستی کے پھیلانے

میں سب سے بڑی رکاوٹ دارالعلوم دیوبند کو باور کرتے ہیں، اس لئے دارالعلوم کا نام سنتے ہی ان پر جنون طاری ہوجاتا ہے اور اس عالم جنون میں ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جن کا ہوش وخرد سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا ہے۔

دارالعلوم دیوبند چونکہ روادار اور سیکولر طاقتوں کا حلیف اور شریک کار ہے، جس طرح یہ سیکولر طاقتیں دارالعلوم دیوبند اور اس کے علما وفضلاء سے خیر وتعاون کی امید رکھتی ہیں اسی طرح دارالعلوم کے ارباب حل وعقد بھی یہ توقع رکھتے ہیں کہ وقت پڑنے پر یہ حلیف طاقتیں اپنا دستِ تعاون بڑھائیں گی، لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ فرقہ پرست اور جنونی عناصر دارالعلوم کی عزت وناموس پر پیہم حملہ کرتے رہتے ہیں اور ہمارے یہ حلیف خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں بلکہ بسا اوقات ہماری سیکولر حکومتیں نہ جانے کن ذہنی تحفظات کی بناء پر ان جنونیوں کو ایسے مواقع فراہم کردیتی ہیں کہ وہ دارالعلوم کی عظمتوں سے اپنا سر ٹکرائیں، سیکولر طاقتوں کے اس رویہ سے دارالعلوم دیوبند سے زیادہ خود سیکولر اقدار کو نقصان پہنچ رہا ہے جسے سیکولر حامیوں کو محسوس کرنا چاہئے۔

گو ترے ستم نے ہر اک طرح ہمیں ناامید بنادیا
یہ مری وفا کا کمال ہے کہ نباہ کرکے دکھا دیا

❁ ❁ ❁

ضروری اطلاع

پاکستان وبنگلہ دیش اور غیر ملکی خریداران کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ڈاک کی شرحوں میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے، جس کی وجہ سے ادارہ ان کی سالانہ خریداری میں اضافہ کرنے پر مجبور ہے۔

لہٰذا ماہ جنوری ۲۰۰۹ء سے سالانہ خریداری: پاکستان وبنگلہ دیش سے =/500 روپے (ہندوستانی) اور غیر ممالک سے =/1100 روپے (ہندوستانی) کی جارہی ہے۔

اسلام میں
دیگر اقوام اور اہل مذاہب کے ساتھ رواداری

از: مولانا شوکت علی قاسمی بستوی
استاذ دارالعلوم دیوبند
وناظم عمومی رابطہ مدارس اسلامیہ

یہ پروپیگنڈہ بڑے زوروشور سے کیا جارہا ہے کہ اسلام اور اس کے ماننے والے دوسرے مذہب والوں کو برداشت کرنے کے روادار نہیں، یہ ایک گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے، اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں، یہ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی عالمی سازش کا ایک حصہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام دینِ رحمت ہے، اس کا دامنِ محبت ورحمت ساری انسانیت کو محیط ہے۔ اسلام نے اپنے پیروکاروں کو سخت تاکید کی ہے کہ وہ دیگر اقوام اور اہل مذاہب کے ساتھ مساوات، ہمدردی، غم خواری ورواداری کا معاملہ کریں، اور اسلامی نظامِ حکومت میں ان کے ساتھ کسی طرح کی زیادتی، بھید بھاؤ، امتیاز کا برتاؤ نہ کیا جائے۔ ان کی جان ومال، عزت وآبرو، اموال اور جائداد اور انسانی حقوق کی حفاظت کی جائے۔ ارشاد قرآنی ہے:

لَایَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْن (الممتحنہ:۸)

اللہ تم کو منع نہیں کرتا ان لوگوں سے جو لڑے نہیں دین کے سلسلہ میں اور نکالا نہیں تم کو تمہارے گھروں سے کہ ان کے ساتھ کرو بھلائی اور انصاف کا سلوک، بے شک اللہ چاہتا ہے انصاف والوں کو۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ: مکہ میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو آپ مسلمان نہ ہوئے اور مسلمان ہونے والوں سے ضد اور پرخاش بھی نہیں رکھی نہ

دین کے معاملہ میں ان سے لڑے، نہ ان کو ستانے اور نکالنے میں ظالموں کے مددگار بنے، اس قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ بھلائی اور خوش خلقی سے پیش آنے کو اسلام نہیں روکتا، جب وہ تمہارے ساتھ نرمی اور رواداری سے پیش آتے ہیں تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ تم بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور دنیا کو دکھلا دو کہ اسلامی اخلاق کا معیار کس قدر بلند ہے، اسلام کی تعلیم یہ نہیں کہ اگر غیر مسلموں کی ایک قوم مسلمانوں سے برسرپیکار ہے تو تمام غیر مسلموں کو بلاتمیز ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا شروع کردیں ایسا کرنا حکمت وانصاف کے خلاف ہوگا۔ (حاشیہ: ترجمہ شیخ الہند: ص:۷۲۹)

دیگر مذاہب والوں کے ساتھ تعاون اور عدم تعاون کا اسلامی اصول یہی ہے کہ ان کے ساتھ مشترک سماجی وملکی مسائل ومعاملات میں، جن میں شرعی نقطۂ نظر سے اشتراک وتعاون کرنے میں کوئی ممانعت نہ ہو ان میں ساتھ دینا چاہیے۔

دیگر مذاہب یا اقوام کے کچھ لوگ اگر مسلمانوں سے سخت عداوت اور دشمنی بھی رکھتے ہوں تب بھی اسلام نے ان کے ساتھ رواداری کی تعلیم دی ہے: ارشاد ربانی ہے:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ (سورۂ فصلت:۳۴)

بدی کا بدلہ نیکی سے دو پھر جس شخص کے ساتھ تمہاری عداوت ہے وہ تمہارا گرم جوش حامی بن جائے گا۔

کفار مکہ کے ساتھ حسن سلوک:

وہ کونسا ظلم تھا جو کفار ومشرکین نے مکہ مکرمہ میں سرکار دوعالم ﷺ اور صحابۂ کرام کے ساتھ روا نہ رکھا۔ آپ ﷺ کو جادوگر، شاعر اور کاہن کہا گیا، آپ ﷺ کو جسمانی اور ذہنی اذیتیں دی گئی، آپ ﷺ پر پتھروں اور سنگریزوں کی بارش کی گئی، آپ ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، آپ ﷺ کا گلا گھونٹا گیا، نماز کی حالت میں آپ ﷺ پر اونٹ کی اوجھڑی رکھ دی گئی، آپ ﷺ کے قتل کے منصوبے تیار کیے گئے۔ تین سال تک شعب ابی طالب میں آپ ﷺ کو محصور رکھا گیا۔ جس میں ببول کے پتے کھا کر گزارہ کرنے کی نوبت آئی، طائف میں آپ کو سخت اذیت پہنچائی گئی، لوگوں نے آپ ﷺ کو گالیاں دیں اور اتنا زدوکوب کیا کہ آپ ﷺ کے نعلین مبارک خون سے لبریز ہوگئے۔ آپ ﷺ کو مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کیا گیا۔ آپ ﷺ مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں بھی سکون واطمینان سے رہنے نہیں دیا گیا۔ اور طرح طرح کی یورشیں

جاری رکھی گئیں، یہودیوں کے ساتھ مل کر رحمتِ عالم ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف منصوبہ بند مہم چھیڑ دی گئی۔ فتح مکہ کے موقع پر کفار مکہ کو موت اپنے سامنے نظر آرہی تھی ان کو خطرہ تھا کہ آج ان کی ایذا رسانیوں کا انتقام لیا جائے گا، سرکار دوعالم ﷺ نے ان کو مخاطب کر کے فرمایا: اے قریشیو! تم کو کیا توقع ہے، اس وقت میں تمہارے ساتھ کیا کروں گا؟ انھوں نے جواب دیا: ہم اچھی ہی امید رکھتے ہیں، آپ کریم النفس اور شریف بھائی ہیں اور کریم اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں آپ نے ارشاد فرمایا:

''میں تم سے وہی کہتا ہوں جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا، آج تم پر کوئی الزام نہیں؛ جاؤ تم سب آزاد ہو'' (زادالمعارج:۱/۴۲۴)

کیا انسانی تاریخ اس رحم وکرم کی کوئی مثال پیش کرسکتی ہے؟

یہودیوں کے ساتھ حسن سلوک:

یہودیوں کے مختلف قبائل مدینہ میں آباد تھے، نبی اکرم ﷺ کے مدینہ ہجرت فرما جانے کے بعد، ابتداءً یہود غیر جانب دار اور خاموش رہے لیکن اس کے بعد وہ اسلام اور نبی رحمت ﷺ اور مسلمانوں کے تئیں اپنی عداوت اور معاندانہ رویہ زیادہ دنوں تک نہ چھپا سکے۔ انہوں نے سرکارِ دوعالم ﷺ اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کی خفیہ سازشیں کیں، بغاوت کے منصوبے بنائے، آپ ﷺ کے کھانے میں زہر ملایا آپ ﷺ کو شہید کرنے کی تدبیریں سوچیں، اسلام اور مسلمانوں کو زک پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا، اس کی ایک وجہ یہودیوں میں حسد، تنگ دلی، اور جمود وتعصب کا پایا جانا تھا۔ دوسرے ان کے عقائد باطلہ، اخلاق رذیلہ اور گندی سرشت تھی۔ لیکن قربان جایئے رحمتِ عالم ﷺ پر کہ آپ ﷺ نے ان کے ساتھ نہایت اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا۔

مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد سرکارِ دوعالم ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ ایک اہم معاہدہ کیا تاکہ مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان خوش گوار تعلقات قائم ہوں، اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کریں اور مشکلات میں ایک دوسرے کی مدد کریں، معاہدہ کی چند دفعات یہ تھیں۔

۱- تمام یہودیوں کو شہریت کے وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اسلام سے پہلے انھیں حاصل تھے۔

۲- مسلمان تمام لوگوں سے دوستانہ برتاؤ رکھیں گے۔
۳- اگر کوئی مسلمان کسی یثرب والے کے ہاتھ مارا جائے تو بہ شرط منظوری ورثاء قاتل سے خوں بہالیا جائے گا۔
۴- باشندگان مدینہ میں سے جو شخص کسی سنگین جرم کا مرتکب ہو اس کے اہل وعیال سے اس کی سزا کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔
۵- موقع پیش آنے پر یہودی مسلمانوں کی مدد کریں گے، اور مسلمان یہودیوں کی۔
۶- حلیفوں میں سے کوئی فریق اپنے حلیف کے ساتھ دروغ گوئی نہیں کرے گا۔
۷- مظلوموں اور ستم رسیدہ شخص کی خواہ کسی قوم سے ہو مدد کی جائے گی۔
۸- یہود پر جو بیرونی دشمن حملہ آور ہوگا تو مسلمانوں پر ان کی امداد لازمی ہوگی۔
۹- یہود کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔
۱۰- مسلمانوں میں سے جو شخص ظلم یا زیادتی کرے گا تو مسلمان اسے سزا دیں گے۔
۱۱- بنی عوف کے یہودی مسلمانوں میں ہی شمار ہوں گے۔
۱۲- یہودیوں اور مسلمانوں میں جس وقت کوئی قضیہ پیش آئیگا تو اسکا فیصلہ رسول اللہ کریں گے۔
۱۳- یہ عہد نامہ کبھی کسی ظالم یا خاطی کی جانب داری نہیں کریگا۔ (سیرۃ ابن ہشام: ص: ۵۰۱-تا-۵۰۴)

آپ نے ملاحظہ فرمایا اس معاہدے میں کس فیاضی اور انصاف کے ساتھ یہودیوں کو مساویانہ حقوق دیے گئے ہیں۔

سرکار دوعالم ﷺ اس معاہدے کے مطابق یہودیوں کے ساتھ برتاؤ کرتے رہے لیکن یہودیوں نے اس معاہدے کی پاس داری نہیں کی، مسلمانوں کے خلاف مشرکین مکہ کی مدد کی اور اسلام اور مسلمانوں کے ہمیشہ درپے آزار رہے۔

عیسائیوں کے ساتھ حسن سلوک:

عیسائیوں کے ساتھ بھی سرور عالم ﷺ نے مثالی رواداری برتی۔ مکہ مکرمہ اور یمن کے درمیان واقع ''نجران'' کا ایک موقر وفد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ ﷺ نے ان کو مسجد میں ٹھہرایا انھوں نے سرکار دوعالم ﷺ کے ساتھ مذہبی معاملات میں گفتگو کی عیسائیوں کے ساتھ اس موقع پر ایک تاریخی معاہدہ ہوا، جس میں عیسائیوں کو مختلف حقوق دینے پر اتفاق کیا گیا

ہے۔معاہدہ کی دفعات درج ذیل ہیں:

(۱)ان کی جان محفوظ رہے گی۔(۲)ان کی زمین جائداد اور مال وغیرہ ان کے قبضے میں رہے گا۔(۳)ان کے کسی مذہبی نظام میں تبدیلی نہ کی جائے گی۔مذہبی عہدے دار اپنے اپنے عہدے پر برقرار رہیں گے۔(۴)صلیبیوں اور عورتوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے گا۔(۵)ان کی کسی چیز پر قبضہ نہ کیا جائے گا۔(۶)ان سے فوجی خدمت نہ لی جائے گی۔(۷)اور نہ پیداوار کا عشر لیا جائے گا۔(۸)ان کے ملک میں فوج نہ بھیجی جائے گی۔(۹)ان کے معاملات اور مقدمات میں پورا انصاف کیا جائے گا۔(۱۰)ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہونے پائے گا۔(۱۱)سود خواری کی اجازت نہ ہوگی۔(۱۲)کوئی ناکردہ گناہ کسی مجرم کے بدلے میں نہ پکڑا جائے گا۔(۱۳)اور نہ کوئی ظالمانہ زحمت دی جائیگی۔(دین رحمت:۲۳۹،بحوالہ:فتوح البلدان بلاذری)

مذکورہ بالا جو حقوق اسلام نے دیگر اقوام اور رعایا کو عطا کیے ہیں ان سے زیادہ حقوق تو کوئی اپنی حکومت بھی نہیں دے سکتی۔

جو غیر مسلم اسلامی حکومت میں رہتے ہیں اس کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ اللہ ورسول کی پناہ میں ہیں اسی لیے ان کو ذمی کہا جاتا ہے اسلامی قانون یہ ہے کہ جو غیر مسلم (ذمی) مسلمانوں کی ذمہ داری میں ہیں ان پر کوئی ظلم ہو تو اس کی مدافعت مسلمانوں پر ایسی ہی لازم ہے جیسی خود مسلمانوں پر ظلم ہو تو اس کا دفع کرنا ضروری ہے۔(المبسوط للسرخسی:۱/۸۵)

منافقین کے ساتھ حسن سلوک:

مدینہ منورہ میں ایک طبقہ ان مفاد پرستوں کا بھی پیدا ہوگیا تھا جو زبان سے ایمان لے آیا تھا مگر دل ایمان ویقین سے یکسر خالی تھے، یہ لوگ اسلام کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر بظاہر مسلمانوں کے ساتھ ہوگئے تھے، مسلمانوں کے تئیں سخت کینہ، بغض اور حسد رکھتے تھے، ان کا سربراہ عبداللہ بن ابی ابن سلول تھا، یہ مدینہ کا بااثر آدمی تھا اور سرکار دوعالم ﷺ کے مدینہ تشریف لانے سے پہلے مدینہ کے لوگ اس کو حکمراں بنانے کی تیاری کررہے تھے۔حضور اکرم ﷺ کی ہجرت کے بعد اس کی آرزو خاک میں مل گئی۔اپنے کو مسلمان ظاہر کرنے کے باوجود دل سے کافر ہی رہا، منافقین نے مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی تمام تر کوششیں کیں، نبی رحمت ﷺ کی شان میں گستاخیاں کیں، کافروں اور یہودیوں سے مل کر اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے

منصوبے تیار کیے، ان سب شرارتوں اور عداوتوں کے باوجود سرکار دوعالم ﷺ اور مسلمانوں نے ان کے ساتھ بھی حسن اخلاق اور رواداری ہی کا معاملہ فرمایا عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ بھی سرکار دوعالم ﷺ نے پڑھائی۔ ان کے لڑکے کی درخواست پر اپنا جبہ مبارکہ اس کے کفن کے لیے مرحمت فرمایا۔

اسلامی حکومت میں غیرمسلم رعایا (ذمیوں) کے حقوق:

اسلام تمام افراد بشر اور طبقات انسانی کے لیے رحمت ورافت کا پیکر بن کر آیا تھا، اس لیے اس نے غیر مسلم اقوام اور رعایا کے ساتھ مثالی رحم وکرم، مساوات وہمدردی، اور رواداری کا معاملہ کیا ہے اور ان کو انسانی تاریخ میں پہلی بار وہ سماجی اور قومی حقوق عطا کیے جو کسی مذہب یا تمدن والوں نے دوسرے مذہب وتمدن والوں کو کبھی نہیں دیئے۔ جو غیر مسلم اسلامی ریاست میں قیام پذیر ہوں اسلام نے ان کی جان، مال، عزت وآبرو اور مذہبی آزادی کے تحفظ کی ضمانت دی ہے۔ اور حکمرانوں کو پابند کیا ہے کہ ان کے ساتھ مسلمانوں کے مساوی سلوک کیا جائے۔ ان غیر مسلم رعایا (ذمیوں) کے بارے میں اسلامی تصور یہ ہے کہ وہ اللہ اور رسول کی پناہ میں ہیں۔ اس بناء پر اسلامی قانون ہے کہ جو غیر مسلم، مسلمانوں کی ذمہ داری میں ہیں ان پر کوئی ظلم ہو تو اس کی مدافعت مسلمانوں پر ایسی ہی لازم ہے جیسی خود مسلمانوں پر ظلم ہو تو اس کا دفع کرنا ضروری ہے۔ (مبسوط سرخسیؒ: ۱/۸۵)

اگر کوئی مسلمان ذمی پر ظلم کرتا ہے تو یہ مسلمان پر ظلم کرنے سے زیادہ سخت ہے۔ (درمختار مع ردالمحتار: ۵/۳۹۶)

جو حقوق مسلمانوں کو حاصل ہیں وہی حقوق ذمیوں کو بھی حاصل ہوں گے، نیز جو واجبات مسلمانوں پر ہیں وہی واجبات ذمی پر بھی ہیں۔ ذمیوں کا خون مسلمانوں کے خون کی طرح محفوظ ہے اور ان کے مال ہمارے مال کی طرح محفوظ ہے۔ (درمختار کتاب الجہاد)

اسلام نے طے کیا ہے کہ جو شخص اس غیر مسلم کو قتل کرے گا جس سے معاہدہ ہو چکا ہے وہ جنت کی بو سے بھی محروم رہے گا جب کہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت تک پہنچتی ہے۔ (حدیث شریف: ابن کثیر: ۲/۲۸۹)

ذمیوں کے اموال اور املاک کی حفاظت بھی اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے۔

سرکار دوعالم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: سنو جو کسی معاہد (غیر مسلم) پر ظلم کرے، یا اس کے حقوق میں کمی کرے گا، یا طاقت سے زیادہ اس کو مکلّف کرے گا یا اس کی کوئی چیز اس کی مرضی کے بغیر لے گا تو میں قیامت کے دن اس کی طرف سے دعوے دار بنوں گا (مشکوٰۃ شریف: ص:۳۵۴)

غیر مسلم رعایا کو اتنی آزادی حاصل تھی کہ ان کے تعلیمی ادارے آزاد ہوتے اور ان کے شخصی قوانین کے لیے عدالتیں بھی آزاد رہیں۔

ذمیوں کو جو حقوق اسلام میں عطا کیے گئے ہیں وہ معاہدۂ اہل نجران کے ضمن میں تفصیل سے بیان کیے جاچکے ہیں۔

مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے والوں کے سلسلہ میں اسلامی ہدایات:

مکہ مکرمہ میں مسلمانوں پر کفار مظالم کے پہاڑ توڑ رہے تھے، ان کا جینا دوبھر کردیا تھا ہر طرح سے ان کو پریشان کیا جارہا تھا، مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے حبشہ اور پھر مدینہ منورہ چلے جانے کے بعد بھی سکون میسر نہ آیا، اور کفار یہود اور منافقین کی مشترکہ سازشوں کا شکار رہے۔ مدینہ کو تاخت وتاراج کرنے اور مسلمانوں کو ملیامیٹ کرنے کے ارادے سے ایک لشکر جرار نے مدینہ پر چڑھائی کردی اس انتہائی مجبوری کی حالت میں اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہ گیا تھا کہ تلوار کا مقابلہ تلوار سے کیا جائے چناں چہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو لڑائی کی اجازت دی اور فرمایا: حکم ہوا ان لوگوں کو جن سے کافر لڑتے ہیں، اس واسطہ کہ ان پر ظلم ہوا۔ اور اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے وہ لوگ، جن کو نکالا گیا ان کے گھروں سے اور دعویٰ کچھ نہیں سوائے اس کے، کہ وہ کہتے ہیں ہمارا رب اللہ ہے۔ (سورہ حج: آیت:۳۹)

جہاد کی اجازت ظلم وستم کے مقابلہ کے لیے دی گئی اور برسرپیکار لوگوں کے سلسلہ میں بے نظیر رواداری اور حسن اخلاق کی تعلیم بھی دی گئی جو کسی بھی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی چناں چہ اس سلسلہ میں ہدایات درج ذیل ہیں:

(۱) جنگ میں خود پیش قدمی سے روکا (بقرہ:۱۹۱) (۲) ظلم وزیادتی کی ممانعت کی (بقرہ:۱۹۰) (۳) جنگ کی بس اس وقت تک اجازت دی جب تک فتنہ وفساد فرونہ ہوجائے (حج:۱۳۹) (۴) دشمن کے قاصدوں کو امن دیا (ہدایہ ونہایہ:۳/۴۷) (۵) دشمن کی عورتوں، بچوں، معذوروں، کو مارنے سے منع کیا (تاریخ ابن خلدون:۲/۴۸۹) (۶) سرسبز کھیتوں اور پھل دار درختوں کے کاٹنے کی

ممانعت فرمائی (تاریخ ابن خلدون:۲/۴۸۹) (۷) عبادت گاہوں کو ڈھانے اور تارک الدنیا عابدوں اور مذہبی رہنماؤں کو قتل کرنے سے روکا (ایضاً) (۸) اسیران جنگ کو تکلیف پہنچانے کی ممانعت فرمائی۔ (۹) دشمن اپنے کو کم زور دیکھ کر صلح کی درخواست کرے تو اسے قبول کرنے کی ہدایت فرمائی۔ (۱۰) پناہ میں آنے والے غیر مسلم کو امن دینے اور عافیت سے رکھنے کی تاکید فرمائی۔ (سورۂ توبہ:۳۶) (۱۱) محض مال غنیمت کے لیے جہاد کرنے سے روکا۔ (ابوداؤد:۱/۳۴۸) (۱۲) لوٹ کے مال کو حرام قرار دیا۔ (تاریخ ابن خلدون) (۱۳) معاہدہ کرنے والے ذمیوں کی جان و مال کی پوری حفاظت کا مسلمانوں کو پابند فرمایا۔ (دین رحمت:۲۳۹، بحوالہ فتوح البلدان)

وطن کی محبت اسلام میں:

یہ حقیقت ہے کہ انسان کو دنیا میں جینے اور زندگی بسر کرنے کے لیے ہمیشہ ہی غذا کی ضرورت پڑتی ہے انسان کو یہ غذا زمین سے حاصل ہوتی ہے اور بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان مٹی سے پیدا ہوا ہے، سورۂ حج میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ دوسری آیت شریفہ میں ارشاد فرمایا ہے: ہم نے تم کو زمین میں ٹھہرایا اور تمہارے لیے زندگی کے سامان زمین سے پیدا کیے (سورۂ اعراف) دوسری آیت کریمہ میں ارشاد ربانی ہے: تم زمین میں ہی زندگی بسر کروگے اور زمین میں ہی مروگے اور زمین میں سے ہی نکالے جاؤگے (سورۂ اعراف) جس زمین سے آدمی کا خمیر اٹھا ہے جہاں وہ پیدا ہوا اور زندگی بسر کررہا ہے اس سے انسان کو فطری لگاؤ اور تعلق ہوتا ہے، اسی لیے عربی زبان کا مشہور مقولہ ہے: انسان کی پیدائشی سرزمین اس کی دودھ پلانے والی ماں ہے، مشہور حکیمانہ جملہ ہے: حب الوطن من الایمان: وطن کی محبت ایمان کا تقاضا ہے۔

سرور عالم ﷺ جب ہجرت فرما کر مکہ مکرمہ سے جانے لگے تو فرمایا کرتے تھے: اے مکہ تو خدا کا شہر ہے تو مجھے کس قدر محبوب ہے، اے کاش تیرے باشندے مجھے نکلنے پر مجبور نہ کرتے تو میں تجھ کو نہ چھوڑتا۔ (جمع الفوائد:۱/۱۹۵)

جب سرور عالم ﷺ نے مدینہ منورہ کو وطن بنالیا تو دعا میں فرمایا کرتے تھے: اے اللہ ہمارے اندر مدینے کی اتنی محبت پیدا کردے جتنی تو نے مکہ کی محبت دی ہے، مدینے کی آب وہوا درست فرمادے اور ہمارے لیے مدینے کے صاع اور مد (ناپنے کے پیمانے) میں برکت عطا فرما

اور مدینہ کے بخار کو (جحفہ مقام) کی طرف منتقل فرمادے۔ (بخاری شریف:۱/۵۵۸)

اس حدیث شریف سے وطن عزیز کی محبت کا بھی بخوبی پتہ چلتا ہے نیز اس کی اقتصادی ترقی اور آب وہوا کی درستگی اور صحت وعافیت کی بحالی کی شدید رغبت بھی ظاہر ہوئی ہے، اس لیے وطن مالوف کی محبت فطری تقاضا بھی ہے اور شرعی بھی۔

ہندوستان کی فضیلت:

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ، سابق صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند وصدر جمعیۃ علماء ہند رقم طراز ہیں:

''اسلامی کتابیں یہ بتاتی ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام ہندوستان ہی میں اتارے گئے اور یہاں ہی سکونت کی، اور یہاں ہی سے ان کی نسل دنیا میں پھیلی اور اسی وجہ سے انسانوں کو آدمی کہا جاتا ہے''۔ (ہمارا ہندوستان اور اس کے فضائل، بحوالہ تفسیر ابن کثیرؒ:۱/۸۰)

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب علیہ الرحمہ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند تحریر فرماتے ہیں:

''ہندوستان نبوت کا دارالخلافہ ہے، یہاں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام تشریف لائے حضرت شیث علیہ السلام دوسرے رسول تھے جو اس سرزمین پر وارد ہوئے ان کی قبر شریف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اجودھیا میں ہے''۔

دارالعلوم دیوبند کے بانی حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ نے اپنی بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ رام چندر جی اور کرشن جی کے نام ادب سے لیے جائیں اور ان کے ساتھ گستاخی نہ کی جائے۔ (قومی اتحاد:ص:۷)

حضرت مولانا محمد میاں صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

(۱) انسانیت کا دارالخلافہ ہندوستان ہے۔ (۲) چوں کہ خلیفہ نبی تھا جس کے پاس حضرت جبرئیل تشریف لایا کرتے تھے لہٰذا سرزمین ہند سب سے پہلے آفتاب نبوت کا مشرق بنا۔ (۳) اسی سرزمین پر سب سے پہلے حضرت جبرئیل کا نزول ہوا۔ (۴) ابن سعد نے طبقات میں نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کے جسم کا خمیر ''وجنی'' نامی علاقے کی خاک سے بنایا ہے۔ لہٰذا ہندوستان کو یہ شرف حاصل ہے کہ سب سے پہلے نبی ﷺ کا خمیر یہیں کی خاک سے

بنایا گیا اور حضرت آدم تمام انسانوں کے ابوالآباء تھے اس لیے جملہ انبیاء اور تمام انسانوں کے روحانی اور مادّی اصل واصول کا خمیر ہندوستان ہی سے بنایا گیا، توالد وتناسل کے اصول پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جملہ انبیاء، اولیاء اور صلحاء کرام علماء ومشائخ کا اوّلین عنصر اسی خاک پاک سے وجود پذیر ہوا۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ عہدِ الست ہندوستان کے مقام وجنی میں ہی لیا گیا۔ اللہ نے تمام انسانوں کی روحوں کو حضرت آدم کی پشت سے برآمد کرکے ان کو خطاب کیا اور فرمایا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ تمام روحوں نے متفقہ طور پر اللہ کی پروردگاری کو تسلیم کرتے ہوئے کہا ضرور آپ ہی ہمارے پروردگار ہیں۔ (ہمارا ہندوستان اور اس کے فضائل)

وطن عزیز ہندوستان میں مسلمانوں کے ملکی فرائض:

محدث عصر حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ سابق صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند فرماتے ہیں:

''ہندوستان یا کسی دوسرے غیر مسلم اکثریت والے ملک میں ہر مسلمان اس بات کا ذمہ دار ہے کہ اسلام نے عام انسانوں کے لیے امن اور آزادی کے جو حقوق تسلیم کیے ہیں اپنے اختیار اور اپنی طاقت کی حد تک ان حقوق کی حفاظت کرے ظاہر ہے اس مقصد کے تحت ہر مسلمان کو ملک کی سیاسی، معاشی اور شہری سرگرمیوں میں بقدر طاقت حصہ لینا پڑے گا، تاکہ اپنے ہاتھ میں سیاسی اور معاشی قوت کے ذریعہ وہ ملک کے عام باشندوں کی جان ومال اور روٹی کپڑے کے حقوق کی حفاظت کا اپنے وسائل کی حد تک فرض انجام دے سکے۔ ایک مسلمان اگر محض تماشائی بن کر زندگی گذارنا چاہے اور ملک کی سیاسی سرگرمیوں اور معاشی واقتصادی جدوجہد سے کنارہ کش رہے تو وہ خدا کے عام بندوں کی خدمت کا فرض کیسے ادا کرسکتا ہے۔''

(ہندوستان میں مسلمانوں کے ملکی فرائض)

ہمارے اکابر علماء کرام اور عام مسلمانوں نے ہمیشہ ملک میں محبت واتحاد، حسن معاشرت، فرقہ وارانہ یگانگت اور قومی یک جہتی ورواداری کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ فرماتے ہیں:

''ہم باشندگانِ ہندوستان بحیثیت ہندوستانی ہونے کے، ایک اشتراک رکھتے ہیں،

جو کہ اختلافِ مذاہب اور اختلاف تہذیب کے ساتھ ہر حال میں باقی رہتا ہے جس طرح ہماری صورتوں کے اختلافات ذاتوں اور صورتوں کے تباین، رنگتوں اور قامتوں کے افتراقات سے ہماری مشترکہ انسانیت میں فرق نہیں آتا اسی طرح ہمارے مذہبی اور تہذیبی اختلافات ہمارے وطنی اشتراک میں خلل انداز نہیں ہیں، ہم سب وطنی حیثیت سے ہندوستانی ہیں۔''

لہٰذا وطنی منافع کے حصول اور مضرتوں کے ازالے کا فکر اور اس کے لیے جدوجہد مسلمانوں کا بھی اسی طرح فریضہ ہے جس طرح دوسری ملتوں اور غیر مسلم قوموں کا اس کے لیے سب کو مل کر پوری طرح کوشش کرنی ازبس ضروری ہے، اگر آگ لگنے کے وقت تمام گاؤں کے باشندے آگ نہ بجھائیں تو تمام گاؤں برباد ہوجائے گا، اور سبھی کے لیے زندگی وبال ہوجائے گی۔ اسی طرح ایک ملک کے باشندوں کا فرض ہے خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا پارسی کہ ملک پر جب کوئی عام مصیبت پڑجائے، تو مشترکہ قوت سے اس کے دور کرنے کی جدوجہد کریں اشتراک وطن کے فرائض سب پر یکساں عائد ہوتے ہیں، مذاہب کے اختلاف سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی، ہر ایک اپنے مذہب پر پوری طرح قائم رہ کے ایسے فرائض کو انجام دے سکتا ہے، یہی اشتراک، میونسپل بورڈوں، کونسلوں، اسمبلیوں میں پایا جاتا ہے، اور مختلف المذاہب ممبر فرائض شہر یا ضلع یا صوبہ یا ملک کو انجام دیتے ہیں اور اس کو ضروری سمجھتے ہیں۔ یہی معنی اس جگہ متحدہ قومیت کے ہیں۔ (ماخوذ از خطبات فدائے ملت: ص:۱۶، ۲۱۵)

❁ ❁ ❁

ہندوستان میں اشاعت اسلام سے متعلق اعتراضات کا جائزہ

از: ڈاکٹر مفتی محمد شمیم اختر قاسمی

ملک ہندوستان اور عرب دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے واقع ہے، البتہ درمیان میں سمندر حائل ہے، جس نے ایک دوسرے کو الگ کر رکھا ہے۔ ہندوستان میں عربوں کی آمد و رفت بہت قدیم زمانہ سے ہی جاری ہے۔ بعثت نبوی کے وقت اور اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ تاہم عہد نبوی میں نور نبوت کے جو اثرات یہاں پڑے اس کا تاریخی اور مستند رکارڈ نہیں ملتا۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں جو ہندوستانی وفود بحری راستوں سے ہندوستان آئے اس کے اچھے اثرات ضرور مرتب ہوئے۔ مذہب اسلام کی اشاعت کے لیے بالخصوص ہندوستان میں جو کام ہوا اس کا علاقہ محدود رہا اور جنوبی ہند کے علاوہ شمالی ہند کی طرف مسلمان تاجروں اور مبلغوں کا آنا بھی مشتبہ ہے۔

ہندوستان میں اسلامی حملے شمالی حصے میں اموی عہد میں ہوئے۔ اسے اگر قرآنی پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ حملے یہاں کے ہنود کے ظلم وزیادتی اور دین اسلام سے متعلق شرانگیزیوں اور فساد کاریوں کے انسداد کے ضمن میں ہوئے۔ کیوں کہ سندھ کے راجا داہر کی سب سے پہلی اور بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے دشمنان اسلام (علائی خاندان کے چند نوجوانوں) کو اپنے ملک میں پناہ دے رکھی تھی جس کی وجہ سے وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نازیبا حرکتوں کا ارتکاب کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کا دوسرا جرم یہ تھا کہ راجہ کے ہی ملک میں مسلمان مسافروں کو لوٹ لیا گیا تھا۔ یہ لوگ مظلوم تھے اور قرآن نے ایسے ظالموں سے جنگ کرنے کا حکم دیا ہے۔

حجاج بن یوسف نے نہایت عقلمندی سے کام لے کر اپنے سفیر کو راجہ داہر کے پاس بھیجا اور مسلمانوں کی مدد کا خواستگار رہوا، مگر وہ تعاون کے بجائے سخت سست جواب دیا اور کہا کہ تم خود ان

لٹیروں سے نمٹ لو۔ گویا کہ راجہ داہر کی نادانستہ غلطی تھی اور اس طرح اس نے مسلمانوں کو اپنے ملک میں حملہ کرنے کی دعوت دے دی۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مسلمانوں کو لوٹنے والے راجہ داہر کے ہی لوگ تھے، قرائن وشواہد سے یہی پتہ چلتا ہے۔ بہرحال حملہ کا آخری عمل محمد بن قاسم کے ذریعہ وقوع پذیر ہوا اور تھوڑی ہی مدت میں پورا سندھ اسلام کے زیر نگیں ہوگیا۔ محمد بن قاسم کے بعد یہاں اہم فتوحات تو نہ ہوسکیں، البتہ سندھ کا تعلق مرکز خلافت سے وابستہ رہا اور جب خلیفہ عباسی کی سیاسی طاقت کمزور پڑ گئی تو غزنین و بخارا میں ایک دوسری سلطنت قائم ہوئی جس کے حکمراں سبکتگین ہوئے۔

غزنی کی سرحد ہندوستان سے ملتی تھی۔ چنانچہ محمد بن قاسم کے دوسو سال کے بعد پنجاب کے راجہ جے پال نے بے جا غزنین کی مسلم سلطنت پر حملہ کر کے اسے اپنے ملک میں شامل کرنا چاہا اور دوسری طرف قرمطیوں کی سرپرستی کرنے لگے۔ ان لوگوں نے بھی اسلام اور اہل اسلام کو زدوکوب کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑ رکھی تھی۔ لہٰذا سبکتگین نے ان راجاؤں سے سخت جنگ کی اور اس کی طاقت کو کمزور و منتشر کر کے قرمطیوں کے خلاف سخت کاروائی کی۔

یہ بے جا مداخلت راجہ جے پال کی طرف سے دوبارہ مسلمانوں کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی ایک دعوت تھی۔ صلح حدیبیہ کو سامنے رکھا جائے اور راجہ داہر کی وعدہ خلافی وعہد شکنی پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں یہ لوگ مجرم تھے اور جن سے جنگ ناگزیر تھی۔ اس کے بعد محمود نے پے در پے حملے کر کے ہندوستان کے کچھ سرحدی علاقوں کو سلطنت اسلامیہ سے ضرور جوڑ دیا، مگر یہ الحاق مستقل نہ تھا بلکہ عارضی ہی رہا۔ محمود کے بعد اسی خاندان نے ڈیڑھ سو سال سے زائد عرصے تک غزنین کی سلطنت کو زینت بخشی، تاہم انہیں وہ نمایاں کامیابی نہیں مل سکی جو شہاب الدین غوری کے لیے تھی۔

شہاب الدین کا حملہ ہند بھی اسلامی نقطہ نظر سے اس لیے درست تھا کہ وہ مسلمان جو ملتان، پنجاب، لاہور، بھٹنڈا اور دوسرے علاقوں میں مقیم تھے اور جن کی نگرانی کے لیے غزنی کے ولاۃ مامور تھے، وقتاً فوقتاً ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر پرتھوی راج انہیں تکلیف پہونچاتا تھا۔ اس کے علاوہ ان علاقوں میں قرمطیوں کی طاقت دن بہ دن بڑھتی ہی جارہی تھی، یہاں تک کہ یہ لوگ گجرات و کاٹھیاوار تک اپنے اثرات کو وسیع کر چکے تھے۔ ان کے عزائم ہندوؤں کے منصوبے سے ملتے جلتے تھے، اس لیے ہندو بھی ان کی سرپرستی کرنے میں پیش پیش تھے۔ جب کہ

غوری بھی قرامطہ کے وجود اور اس کی حرکتوں سے سخت نالاں تھا۔

دوسری طرف یہ سلطان غزنی فرمارواؤں سے بھی بعض وجوہ کی بنا پر سخت عداوت رکھتا تھا۔ لہٰذا شہاب الدین کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہ تھا کہ وہ اپنی فوج لے کر ہندوستان پر چڑھائی کرے اور مسلمانوں کو یہاں کے راجاؤں کے ظلم اور دین کے دشمنوں سے نجات دلائے۔ قرآن نے ایسے حملوں کی اجازت دیتے ہوئے صاف اعلان کیا ہے:

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علیٰ نصرھم لقدیر۔ (الحج:۳۹)

(اجازت دی جاتی ہے ان لوگوں کو جن سے جنگ کی جارہی ہے کہ وہ بھی جنگ کریں، اس لیے کہ وہ مظلوم ہیں اور یاد رکھیں کہ اللہ ان کی نصرت پر قادر ہے۔)

معترضین اسلام کا اعتراض کب درست ہوتا:

ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کے سلسلے میں جو اعتراضات کیے جاتے ہیں بالعموم وہ وہی ہیں جو پوری دنیا میں اسلام کے پھیلنے کے سلسلے میں کیے جاتے ہیں۔ حضرت محمد ﷺ سے لے کر بعد کے جتنے مسلمان فرمارواؤں نے دنیا کے جن جن علاقوں میں حکمرانی کی ان میں بیش تر کے سلسلے میں یہی الزام عائد کیا جاتا ہے کہ ان حکمرانوں نے تلوار کے ذریعہ اسلام کو پھیلایا۔ البتہ یہ اعتراضات ہندوستانی افق پر زیادہ واضح نظر آتے ہیں۔ مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ ان اعتراضات کی ابتدا اس وقت ہوئی جب مسلمان حکمرانوں کی تلوار زنگ آلود ہوگئی تھی۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اس پہلو پر بہت اچھے انداز میں روشنی ڈالی ہے:

''دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کے لیے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خون خوار مذہب ہے اور اپنے پیروؤں کو خوں ریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اس وقت پیش ہونا چاہیے تھا جب کہ پیروان اسلام کی شمشیر خاراشگاف نے کرہ زمین میں ایک تہلکہ برپا کر رکھا تھا اور فی الواقع دنیا کو یہ شبہ ہوسکتا تھا، کہ شاید ان کے یہ فاتحانہ اقدامات کسی خوں ریز تعلیم کا نتیجہ ہوں۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس بہتان کی پیدائش آفتاب عروج اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اس کے خیالی پتلے میں اس وقت روح پھونکی گئی جب کہ اسلام کی

تلوار تو زنگ کھا چکی تھی مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار بے گناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اس طرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدہا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جب لوگ خود امن وامان کے سب سے بڑے دشمن ہوں جنہوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کر دیا ہو اور جو خود قوموں کے چین وآرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں، انہیں کیا حق ہے کہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جس کی فرد جرم خود ان پر لگنی چاہیے؟ کیا ان تمام مؤرخانہ تحقیق وتفتیش اور عالمانہ بحث واکتشاف سے ان کا یہ منشا تو نہیں کہ دنیا کی اس نفرت وناراضی کے سیلاب کا رخ اسلام کی طرف پھیر دیں جس کے خود ان کی اپنی خوں ریزی کے خلاف امنڈ کر آنے کا اندیشہ ہے۔'' (۱)

اسلام کے خلاف جس قدر پروپیگنڈے ہوئے، اسلام اتنا ہی زیادہ پھیلا:

عالمی افق پر یا پھر ہندوستانی تناظر میں دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اشاعت اسلام سے متعلق اس پروپیگنڈے کے باوجود اسلام ہر جگہ تیزی سے پھیل رہا ہے۔ حالاں کہ اسلام کے علاوہ اور بھی بہت سے مذاہب ہیں جن کے ماننے والوں کی تعداد بہت ہے۔ خود ہندوستان میں اسلام پر روک لگانے کے لیے بڑی بڑی تنظیمیں کام کر رہی ہیں اور اس سے متعلق لوگ بڑی تعداد میں پورے ہندوستان میں پھیلے ہوے ہیں۔ باوجود اس کے انہیں اس میں کامیابی نہیں مل رہی ہے۔ ہندو مذہب کے ماننے والے ہوں یا بدھ دھرم کے علم بردار، یا پھر جینی ہوں یا سکھ فرقوں کے لوگ۔ بحیثیت مذہب کے ان کی تعداد میں کمی ہو رہی ہے اور اسلام کے ماننے والوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اسلام خون خوار مذہب ہوتا تو یہ عمل موقوف ہو جاتا۔ بلکہ سچی بات یہ ہے کہ پروپیگنڈہ ہی اسلام کی اشاعت کی راہ ہموار کر رہا ہے۔ ایک ہندو مفکر راجندر نرائن کے اس خیال میں صداقت نظر آتی ہے:

''دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے خلاف جس قدر غلط پروپیگنڈہ ہوا کسی دوسرے دھرم کے خلاف نہیں ہوا۔ سب سے پہلے تو رسول اللہ ﷺ کے قبیلہ قریش ہی نے اسلام کی مخالفت کی اور دوسرے کئی ذرائع

کے ساتھ غلط پروپیگنڈہ اور مظالم کا راستہ اپنایا۔ یہ بھی اسلام کی خصوصیت ہی ہے کہ اس کے خلاف جس قدر پروپیگنڈہ ہوا اتنا ہی پھیلتا اور ترقی کرتا گیا اور یہ بھی اسلام کے سچے اور الٰہی دین ہونے کا ایک ثبوت ہے۔ اسلام کے خلاف جس قدر پروپیگنڈے کیے گئے اور کیے جاتے ہیں، ان میں سب سے جارحانہ پروپیگنڈہ یہ ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو دنیا میں متعدد مذاہب کے ہوتے ہوئے اسلام ہی معجزاتی طور پر دنیا بھر میں کیسے پھیل گیا؟ اس سوال یا شبہ کا مختصر اجواب تو یہ ہے کہ جس زمانہ میں اسلام کے اس نئے ایڈیشن کی اشاعت ہوئی سابقہ دھرموں کے بے کردار پیروکاروں نے دھرم کو بھی بھرشٹ کردیا تھا، اس لیے انسانی فلاح کی خاطر اللہ کی مرضی کے مطابق اسلام کامیاب ہوا اور دنیا بھر میں پھیلا، تاریخ اس کی گواہ ہے۔'' (۲)

ہندوستان میں اشاعت اسلام سے متعلق معترضین کے گروہ وادوار:

ہندوستان میں اشاعت اسلام پر اعتراض کرنے والوں کو دو گروہ اور دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا گروہ انگریزوں کا ہے جنہوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی اور ان کے زیر سایہ عیسائی مشنریوں نے تبلیغ عیسائیت کی منصوبہ بند کوششیں شروع کیں۔ اسلام ان کے مقاصد کی تکمیل کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ تھا، چنانچہ انہوں نے اسلام پر عیسائیت کی بالاتری دکھانے کے لیے اس کے مختلف پہلوؤں پر جارحانہ حملے کیے اور اسلام کو ایک خوں آشام، غیر متمدن اور فرسودہ مذہب ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ (۳) اسی زمانے میں انگریزوں کے زیر اثر بعض ہندوؤں نے بھی اسلام کے خلاف مناظرانہ محاذ آرائی کی۔ دوسرا گروہ ہندوؤں کا ہے۔ ان اعتراضات کا سلسلہ بالخصوص ہندوستان کی آزادی کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اگرچہ پہلے اس میں اتنی شدت نہ تھی جتنی کہ بعد کے زمانے میں یا عہد حاضر میں پائی جاتی ہے۔ ایک خاص جماعت جو ہندوتو کی علم بردار ہے، اس میں پیش پیش ہے۔ کیوں کہ وہ ملک میں ہندو مذہب اور ہندو تہذیب کا غلبہ چاہتی ہے۔ یہ لوگ باوجود اپنی تمام تر کوششوں کے نہ تو مسلمانوں کو حلقہ بگوش کرسکے ہیں اور نہ ہی اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کو اسلامی تہذیب کے مقابلہ میں برتر ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ اس لیے اب انہوں نے یہ منصوبہ بنایا ہے

کہ اسلام میں زبردستی خامیاں نکالی جائیں اور پروپیگنڈے کے زور پر عوام کے سامنے اسے بھیانک شکل میں پیش کیا جائے۔(۴) اس کے لیے اب انہوں نے ٹی وی چینلوں، ڈراموں، افسانوں، فلموں، قصوں، کہانیوں اور جھوٹی تاریخ نویسی کا سہارا لیا ہے اور وہ مختلف قسم کے بے بنیاد بلکہ خیالی مناظر کے ذریعہ پروپیگنڈہ پھیلا کر لوگوں کو گمراہ کررہے ہیں۔

اعتراضات کے مصادر پر ایک نظر:

ہندوستان میں اشاعت اسلام سے متعلق بالعموم جو اعتراضات کیے جاتے ہیں اسکا شاخسانہ اول وہ لٹریچر ہے جو انگریزوں نے ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت تیار کیا، جس کا خاص مقصد یہ تھا کے یہاں کی دو بڑی قومیں ہندوؤں اور مسلمانوں (جو عرصہ دراز سے پرامن ماحول میں رواداراانہ طریقے سے زندگی بسر کرتے آرہے ہیں) کے درمیان منافرت کی آگ بھڑکا دی جائے، تاکہ وہ ایک دوسرے سے نبرد آزما رہیں اور انہیں اتنی فرصت نہ ملے کہ ہماری جابرانہ اور غاصبانہ حکومت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکیں۔ چنانچہ جب انہوں نے ہندوستان کی تاریخ رقم کی تو ایک طرف مسلمان بادشاہوں کو ظالم و جابر ٹھہراتے ہوئے لکھا کہ وہ ہندوؤں کے سخت دشمن تھے، دوسرے مذاہب کے ماننے والوں پر مظالم ڈھاتے اور ان کے مذہبی مقامات کو مسمار کرتے تھے، تو دوسری طرف یہ شوشہ بھی چھوڑ دیا کہ شیواجی مسلمانوں کے حق میں بڑے سخت واقع ہوئے تھے، کیوں وہ ہندو پرست تھے۔ اس قسم کے اعتراضات سب سے پہلے بمبئی کے گورنر الفسٹن کے قلم سے صفحہ قرطاس پر آئے اور جو بہت جلد ملک کے کونے کونے میں پھیلا دیے گئے۔ یہاں تک کہ اسے شامل نصاب کرکے بچوں کو بھی پڑھایا جانے لگا۔(۵)

ہسٹری آف انڈیا اور آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا، تاریخی اعتبار سے بڑی اہم کتابیں سمجھی اور پڑھی جاتی ہیں، یہ ڈاکٹر ونسنٹ اے اسمتھ کی سخت عرق ریزی کے ساتھ بڑی لاگت کے بعد زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔ ان کی جو انفرادیت اور اہمیت ہے وہ بھی اہل علم کے نزدیک مسلم ہے، مگر اس کتاب کے مطالعہ سے جہاں بہت سے اہم گوشے واضح ہوتے ہیں وہیں زہریلے بیانات بھی پڑھنے کو ملتے ہیں۔ اکثر معمولی واقعات کو فرقہ وارانہ رنگ دے کر مسلم حکمرانوں کی خوبیوں پر پردہ ڈالا گیا ہے اور خامیوں کو مبالغہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مسلمان سلاطین متعصب اور تنگ نظر تھے، ان کا مقصد ہندوؤں کو تباہ کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ

تھا، ہندوستان میں اکثر مسلمانوں کے آباء واجداد خوف یا لالچ سے مذہب تبدیل کیا تھا، اور انگریزوں نے آکر ہندوؤں کو مسلمانوں کے پنجۂ ظلم سے نجات دلائی۔

الیٹ اور ڈاؤسن نے ہندوستان کی جو تاریخ لکھی اس میں بھی فرقہ وارانہ روش اختیار کی گئی ہے۔ اس کے دیباچہ میں نہ صرف مسلمان بادشاہوں کو ظالم و جابر ٹھہرانے کے لیے پوری علمی توانائی استعمال کی گئی ہے، بلکہ پیغمبر اسلام ﷺ کی شخصیت کو بھی مجروح کیا گیا ہے۔(۶) ایسا انہوں نے کیوں کیا اس کی وضاحت خود مصنف نے کتاب کے دیباچہ میں کردی ہے جو مصنف کی بڑی لغزش تھی۔ جس کے متعلق پروفیسر خلیق احمد نظامی نے لکھا ہے:

''ہمیں الیٹ کا مشکور ہونا چاہیے کہ اس نے اپنے مقاصد کا اظہار ایک عرض داشت (Memorandum) میں انگلستان کی حکومت سے کرنے کا فیصلہ کیا، اس عرض داشت کو بعد میں کتاب کا جزو بنا کر شائع کردیا گیا، بغیر یہ سوچے کہ مستشرقین کے خلاف یہ سب سے بڑی دستاویز ہے جو ان کے مفسدانہ مقاصد کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہے۔''(۷)

علامہ سید سلیمان ندوی نے بھی مؤرخ کی کتاب پر جو تنقیدی ریمارک کیا ہے وہ بڑا ہی دلچسپ ہے اور جس سے ان کے عزائم کا پردہ فاش ہوتا ہے۔(۸) اسی طرح عصر حاضر کے ایک مورخ نے مذکورہ کتاب کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے اس سے مصنف مذکور کی اسلام دشمنی تو ظاہر ہوتی ہی ہے، مزید برآں اس کتاب کی اہمیت بالکل گھٹ جاتی ہے اور اس کی اسناد مکمل مشکوک ہوکر سامنے آجاتی ہے۔ اس سیاق میں ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی لکھتے ہیں:

''خود ہندوستان میں برسوں پہلے سر ہنری الیٹ اپنی مشہور کتاب ''ہندوستان کی تاریخ خود اپنے مورخین کی زبانی'' ترتیب دے چکے تھے اور ان کے انتقال کے بعد ڈاؤسن کی کوششوں سے شائع بھی ہوچکی تھی۔ اس کتاب کا بنیادی مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ برصغیر میں مسلمانوں کی حکومت ایک بے حد جابرانہ اور انتہائی ظالمانہ حکومت تھی، جس کا عدل وانصاف سے کوئی واسطہ نہ تھا اور جس کے زیر سایہ بنیادی انسانی اقدار قطعی غیر محفوظ تھیں۔ سازش، شراب نوشی، عیاشی اور قتل وغارت گری کا بازار گرم تھا۔ عیش وطرب کے لوازم مہیا کرنے کے لیے عوام کا بے دردانہ استحصال جس کا نشانہ خصوصاً غیر مسلم عوام ہوتے تھے، اس حکومت کا نشانہ امتیاز تھا۔ معاشی

استحصال، سماجی نابرابری اور مذہبی رواداری کا یکسر فقدان اس عہد کی نمایاں خصوصیات تھیں۔غرض اس کتاب کے صفحات سے مسلم دورحکومت کی ایک ایسی تصویر ابھرتی ہے جو کسی بھی طرح قابل فخر نہیں کہی جاسکتی۔اس مقصد کے حصول کے لیے بڑی مہارت اور چابک دستی سے اقتباسات کو ایک خاص ترتیب سے اکٹھا کیا گیا ہے اور انہیں اپنے مخصوص سیاق وسباق سے الگ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ اقتباسات کے انتخابات میں یہ بات خاص طور سے ذہن میں رکھی گئی کہ صرف ایسے حصوں کو منتخب کیا جائے جن سے مسلم حکمرانوں اور ان کے نظام حکومت کی نہایت مکروہ اور گھناؤنی تصویر ابھر کر سامنے آئے۔'' (۹)

اسی طرح ایم۔اے۔ٹائیٹس نے مسلما بادشاہوں کے متعلق جو زہریلا مواد قارئین کی نظر کیا ہے وہ بھی بڑا دل خراش ہے، جسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے سوچی سمجھی پالیسی کے تحت ایک لائحہ عمل تیار کیا تھا اور جس پر بعد تک عمل ہوتا رہا۔جس میں اس نے بالخصوص محمد بن قاسم اور اورنگ زیب سے متعلق سخت بہتان تراشی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ محمد بن قاسم نے سندھ میں مندروں کے انہدام کا جو منصوبہ بند پروگرام شروع کیا تھا، عہد عالم گیری تک جاری رہا۔(۱۰)

بڑی دلچسپ مگر بالکل جھوٹ بات تو یہ ہے کہ 'لارڈ الن برو' نے محاربہ قابل کے بعد ۱۸۴۲ء میں سلطان محمود غزنوی کے مقبرے سے صندل کے کنوار اکھڑوا کر غزنی سے آگرہ تک اس کا جلوس اس اعلان کے ساتھ نکالا کہ سلطان یہ کنوار سومناتھ سے لے گیا تھا۔(۱۱)

یہ اور اس قسم کی دوسری غلط و بے بنیاد باتیں عوام کے سامنے پیش کر کے عوام کے ذہن میں غلط تاثر پیش کرنے کا جو سلسلہ جاری ہوا، مرور زمانہ کے ساتھ اس میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔حالاں کہ جس کنوار کی تشہیر کی گئی اس کے متعلق جلد ہی یہ حقیقت بھی ظاہر ہوگئی کہ یہ باتیں غلط ہیں اور اس کا تعلق سومناتھ سے نہیں ہے، بلکہ یہ مسلمانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔(۱۲)

یہاں جو بات قابل غور ہے وہ یہ کہ کنوار کی تشہیر جلوس کے ذریعہ کی گئی جس کو سب نے دیکھا، مگر حقیقت کا اظہار تحقیق کے ذریعہ ہوا، جس کا علم بہت کم لوگوں کو ہوسکا۔اس واقعہ سے عوام کا ذہن کس حد تک پراگندہ ہوا ہوگا اس پر تبصرہ کرنے کی قطعی ضرورت نہیں۔

سب جانتے ہیں کہ عہد وسطی کی تاریخ لکھنے کی طرف ہندوؤں نے توجہ نہ دی۔سوائے کلہن کی راج ترنگی کے کوئی اہم تاریخی کتاب ہندوؤں کے یہاں نہیں پائی جاتی اور وہ بھی کشمیر کے

حالات سے تعلق رکھتی ہے۔تاریخ نویسی کا کام مسلمانوں نے ابتدا سے کیا ہے اور یہ فن ہندوستان میں سلاطین کے عہد میں عروج پر پہونچا۔کم وبیش اکثر فرمارواؤں کے زمانہ کی تاریخ کسی نہ کسی حد تک رقم ہوئی۔جس کی زبان فارسی،عربی اور ترکی ہی تھی۔انگریز شاہ جہاں کے زمانہ سے ہندوستانی افق پر ابھرے۔اس وقت تک اس کی حیثیت اس ملک میں بس اتنی تھی کہ سلاطین اور امرا کو جب کبھی اس کی عیاری اور مکاری کا علم ہوتا تو اس کی گوش مالی اچھی طرح سے کردیتے اور وہ ادھر سے ادھر منتشر ہوجاتے تھے۔اس نے بتدریج ہندوستان میں قدم جمائے۔

یہ امر قابل غور ہے کہ اس مختصر اور افراتفری کے زمانے میں انگریزوں نے کیوں کر اور کس طرح عربی، فارسی اور ترکی زبانوں پر عبور حاصل کرلیا کہ وہ اپنی تاریخی کتابوں میں مسلمانوں کی تاریخ اور دوسری کتابوں کا حوالہ بڑے کروفر سے پیش کرتے ہیں،اور پھر مسلمان مورخ اپنی تاریخی کتابوں میں اپنے بادشاہوں کے ناکردہ مظالم کا ذکر کیوں کرتے جن کا حوالہ انگریز مورخوں نے دیا ہے۔اہم بات تو یہ ہے کہ اس عہد میں جو تاریخی کتابیں تھیں ان میں سے اکثر کتابیں آج بھی پائی جاتی ہیں،جن میں ان بادشاہوں کے مظالم کا ذکر نہیں ہے،اور اگر کہیں کہیں اس طرح کی کچھ باتیں پڑھنے کو مل بھی جاتی ہیں تو اس کے سیاق وسباق سے واقعہ کو جوڑ کر نتیجہ نکالا جانا چاہیے۔

انگریز مورخوں کی دروغ بیانی تو اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ اپنے حوالوں میں مقامی روایت اور گزیٹیر کا حوالہ کثرت سے دیتے ہیں۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہیں کب اتنا وقت میسر آگیا کہ انہوں نے ہندوستان کے ہر علاقے کا سروے تیار کرکے اس کا مکمل ریکارڈ جمع کرلیا۔یہ بات درست ہے کہ اوپر جن کتابوں کا ذکر ہوا ہے ان میں بیشتر کتابیں ۱۹ رویں صدی کے اختتام تک یا آزادی سے قبل زیور طبع سے آراستہ ہوچکی تھیں۔اس وضاحت سے راقم کا مدعا یہ ہے کہ انگریزوں کی لکھی ہوئی کتابیں تاریخی اسناد سے خالی ہیں اور مقامی روایات کی جو کثرت ہے وہ مکمل مشکوک ہے۔(۱۳)اس لیے تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو ان باتوں کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے اور مطالعہ کے وقت بالخصوص ان کی تاریخی اسناد کو ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ انگریزوں کو ان زبانوں پر عبور حاصل تھا تو پھر انہوں نے تصنیف وتالیف اور تراجم کے جو ادارے قائم کیے اس میں مسلمان عالموں کی مدد حاصل نہ کرتے،اگر ان کے معاش کی انہیں فکر تھی تو دوسرے اہم شعبوں میں مسلمانوں کی جو قلت ہوگئی تھی اس کا کیا جواز ہوسکتا ہے؟ دراصل ہندوستان کی تاریخ اور تذکروں کے تراجم وغیرہ پر انہوں نے

جو محنت کی اس سے اسلام کی محبت کے بجائے عناد کا پہلو ظاہر ہوتا ہے۔ کیوں کہ انہوں نے اپنے مقاصد کی کامیابی کے لیے واقعات کو اس انداز میں توڑ مڑور کر پیش کیا ہے کہ اصل واقعہ پلٹ کر رہ گیا اور فرقہ واریت کی بو اس سے ظاہر ہونے لگی ہے۔ چنانچہ مستشرقین کے عزائم کا پردہ فاش کرتے ہوئے نومسلم مفکر علامہ اسد لکھتے ہیں:

''یورپین کا رویہ اسلام کے بارے میں اور صرف اسلام ہی کے بارے میں دوسرے غیر مذاہب اور تمدنوں سے بے تعلقی کی ناپسندیدگی ہی نہیں بلکہ گہری اور تقریباً بالکل مجنونانہ نفرت ہے۔ یہ محض ذہنی نہیں ہے بلکہ اس پر شدید جذباتی رنگ بھی ہے۔ یورپ بدھشٹ اور ہندو فلسفوں کی تعلیمات کو قبول کرسکتا ہے اور ان مذہبوں کے متعلق ہمیشہ متوازن اور مفکرانہ رویہ اختیار کرسکتا ہے۔ مگر جیسے ہی اسلام کے سامنے آتا ہے، اس کے توازن میں خلل پڑ جاتا ہے اور جذباتی تعصب آجاتا ہے۔ بڑے سے بڑے یورپین مستشرقین بھی اسلام کے متعلق لکھتے ہوئے غیر معقول جانب داری کے مرتکب ہوگئے ہیں... اس طریقہ عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ کے مستشرقین کے ادب میں ہمیں اسلام اور اسلامی معاملات کی بالکل مسخ شدہ تصویر ملتی ہے۔ یہ چیز کسی ایک خاص ملک میں محدود نہیں بلکہ جرمنی، روس، فرانس، اٹلی، ہالینڈ، غرض ہر جگہ جہاں یورپین مستشرقین نے اسلام سے بحث کی ہے۔ انہیں جہاں کہیں بھی کوئی واقعی یا محض خیالی ایسی بات نظر آتی ہے جس پر اعتراض کیا جاسکے وہاں ان کے دل میں بدنیتی کی مسرت کی گدگدی ہونے لگتی ہے۔'' (۱۴)

ان کے علاوہ ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی کا یہ تبصرہ بھی اس تناظر میں بڑا ہی معنی خیز معلوم ہوتا ہے:

''سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی کو ذہنی وفکری بیداری کے دور سے جانا جاتا ہے، جس میں مستشرقین نے افسانوں، من گھڑت کہانیوں، اوہام وخرافات اور ثانوی مصادر سے قطع نظر بنیادی اور اہم مصادر شریعت اسلامیہ اور معروف ومشہور علمی مراکز کو اپنی توجہات کا مرکز بنایا۔ اسی طرح معقولیت اور عدل وانصاف کے ساتھ ساتھ تعصب وجارحیت کے عناصر بھی علمائے استشراق کے فکر وعمل کے دائرہ کار میں آنے لگے۔ پھر بیسویں صدی کا ربع اول اس لحاظ سے منفرد ہے کہ مستشرقین نے کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے اس دور میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے

ہیں۔یہی وہ زمانہ ہے جس میں فرانس، ہالینڈ، اسٹریلیا، انگلینڈ، جرمنی، سوئزرلینڈ، روس، فن لینڈ اور امریکہ کے مستشرقین سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔'' (۱۵)

آج ہمارے ملک کے بہت سے اہل علم اپنی تحقیق کی وضاحت اسلامی شریعت کے حوالے سے 'انسائیکلوپیڈیا آف اسلام' کی روشنی میں کرتے ہیں، اسلامی فقہ کے نکتے میکڈانل کی کتاب کے ذریعے سے بتائے جاتے ہیں، اسلامی مسائل کا حل ریورنڈ ہیوکی 'ڈکشنری آف اسلام سے پیش کیا جاتا ہے۔مسلمانوں کی حکومت، بادشاہی اور مالیات کے نظریے آرنلڈ اور اگلائی نڈیز کی عینک سے دیکھے جاتے ہیں۔(۱۶) ان کتابوں میں یقیناً بہت سی کارآمد باتیں دیکھنے اور پڑھنے کو مل جائیں گی، مگر قابل اعتبار وہی باتیں ہوں گی جس کی تائید وتوضیح کسی دوسرے اہم ماخذ سے ہو جائے۔چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی نے ایک طرف انگریزوں کی علمی خدمات کو سراہا ہے تو دوسری طرف ان کی اسلامی خدمات کے منشا کو مشکوک ٹھہراتے ہوئے یہ بھی رقم کیا ہے:

''یورپین مستشرقین نے اسلامی علوم وفنون کی جو خدمت کی ہے، اس کا اعتراف ہے۔مگر مذہبی، شرعی اور فقہی معاملات میں ان کی تحقیق یا رائے پر کسی حال میں بھی اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے۔اس لیے مسلمان فرمارواؤں کے کسی رویہ یا پالیسی کو ان کے مذہب کی روشنی میں اگر دیکھنے کی کوشش بھی کی جائے تو مذہبی معاملات کا ماخذ اور سرچشمہ خود مسلمان علماء وفقہا کی اوریجنل، مستند ومعتبر کتابیں ہونی چاہیں، لیکن زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے ان کتابوں کا سمجھنا ممکن نہ ہو تو پھر ایسے موضوع اور مسئلہ پر قلم اٹھانے کا حوصلہ نہ کیا جائے۔نیت خواہ کتنی ہی اچھی اور صاف ہو مگر مذہبی مسائل کی غلط تعبیر اور کلی امور میں ان کی غلط تطبیق سے بعض اوقات ایسے ضرر رساں پہلو پیدا ہوجاتے ہیں جن سے ایک طرف تو حقیقت کا خون ہوتا ہے اور دوسری طرف قوموں کے جذبات میں تلخی پیدا ہوتی ہے۔'' (۱۷)

اسی طرح کی باتیں ایک دوسرے مبصر کی تحریر میں بھی تلاش کی جاسکتی ہے:

''بلاشبہ بہترے علمائے استشراق اپنی بیشتر تحریروں میں علمی دیانت داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔لیکن انہیں میں ایسے علماء بھی خاصی تعداد میں ہیں جنہوں نے تعصب اور تنگ نظری کا سہارا لیتے ہوئے دروغ گوئی اور علمی خیانت کا ارتکاب کیا ہے اور اس طرح اسلام کی تصویر بگاڑنے کی کوشش کی ہے۔'' (۱۸)

جرجی زیدان نے تمدن اسلامی پر بیش بہا اور بڑا ہی قیمتی لٹریچر مسلمانوں کی حمایت اور بظاہر اسلامی علوم سے متأثر ہوکر تیار کردیا ہے، جو چار جلدوں پر مشتمل ہیں۔اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اگر کوئی مسلم مفکر اسلامیات پر تحقیقی کا کام کرتا ہے تو اس کتاب سے خوشہ چینی کیے بغیر نہیں رہتا۔لیکن اس کتاب نے اسلامی علوم وافکار پر جو کاری ضرب لگائی ہے اس کا اندازہ مولانا شبلی کے اس بیان سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

> جرجی زیدان ایک عیسائی مصنف نے یہ کتاب چار حصوں میں لکھی ہے، جس میں مسلمانوں کی تہذیب وتمدن کی تاریخ لکھی ہے، اس کتاب میں مصنف نے در پردہ مسلمانوں پر بڑے اور متعصّبانہ حملے کیے ہیں، لیکن بظاہر مسلمانوں کی مدح سرائی کی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی نظر ان کی فریب کاریوں پر نہیں پڑی اور کتاب گھر گھر پھیل گئی۔'' (۱۹)

پروفیسر آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام کو نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر میں غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، جس میں ہندوستان کے حوالے سے بحث میں اسلام کی اشاعت کا سارا سہرا صوفیائے کرام کے سر ڈال دیا گیا ہے اور کم از کم اس اعتراض سے ہندی مسلمانوں کو نجات ملی جو دوسرے انگریز مؤرخوں نے کی ہے کہ اسلام کی جبری اشاعت ہوئی ہے اور سلاطین وقت نے تلوار کے ذریعہ لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا۔مگر اس کتاب کی زمانہ تصنیف پر بھی نظر رکھی جائے۔ایک طرف الزام واتہام کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے تو دوسری طرف مسلمانوں کے جذبہ جہاد کو سرد کرنے کے لیے اس پر پانی پھیرا جارہا ہے اور اس سے انکار کیا جارہا ہے کہ اسلام کی اشاعت تلوار سے نہیں ہوئی اور پھر مزے کی بات یہ ہے کہ مؤرخ مذکور کی کتاب سے حوالے بھی پیش کیے جارہے ہیں۔اس کتاب میں کہیں آپ کو یہ نظر نہیں آئے گا کہ آرنلڈ نے انگریز مؤرخوں کی تحریر پر تنقید کی ہو اور ان کی عصبیت کا پردہ فاش کیا ہو۔چنانچہ اس کتاب کی تصنیف کے مقاصد کا یقین دلاتے ہوئے عہد حاضر کے ایک مبصر نے لکھا ہے کہ:

> ''یہ بات بعید از قیاس ہے کہ اسلام کے مخالفین اس کے ایک پہلو کو بغیر کسی خاص سبب کے وکالت کرنے لگیں۔اصولی طور پر یہ ممکن نہیں کہ اصل کا مخالف فرع کی حمایت کا بیڑا اٹھالے، اس کے لیے کسی بہت خاص وجہ اور سبب کی موجودگی ضروری ہے۔ظاہر ہے مقصد اسلام سے ہمدردی ہرگز نہ تھی بلکہ پیش نظر انہیں مقاصد کا

حصول تھا جن کے لیے اول الذکر ذریعہ استعمال کیا گیا تھا۔ راستہ بالکل مختلف تھا لیکن نتائج وہی حاصل کرنے تھے۔ مقاصد کے گھناؤنے پن کو البتہ بڑی چابک دستی سے ہمدردی کے دبیز تہوں کے نیچے چھپا دیا گیا تھا۔ مسلمانوں میں تصوف اور صوفیائے کرام کی غیر معمولی مقبولیت کے سہارے ان کی سوچ کے دھارے کو غیر محسوس طور پر ایک نیا رخ دینے کی یہ نہایت شاطرانہ چال تھی۔'' (۲۰)

یہ وہ زمانہ تھا کہ طرح طرح سے اسلام اور مسلمانوں پر انگریزوں کی طرف سے اعتراضات کی بوچھاریں کی جارہی تھیں اور اس طرح مسلمانوں کو اپنے دین و مذہب پر گامزن رہنے سے روکا جارہا تھا، جس کا شافی جواب دینا مسلمانوں کے لیے ضروری ہوگیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس آواز کو دبانے کے لیے ہندوستان کے مختلف علماء نے مختلف اداروں اور محاذوں سے آواز اٹھائی۔ جب رسول پاک ﷺ کی سیرت پر کیچڑ اچھالا گیا تو سرسید نے اس کا مدلل اور مکمل جواب دیا اور ان کے مفسدانہ خیالات کی قلعی کھولی۔ مولانا شبلی تو پوری زندگی مستشرقین کے پیدا کیے ہوئے پروپگنڈہ کا پردہ فاش کرنے میں لگے رہے، جس کے متعلق پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی مدت العمر مستشرقین کی پیدا کی ہوئی گمراہیوں سے برسرپیکار رہے، قرآن کے عدیم الصحہ ہونے کا دعویٰ جب لندن ٹائمس میں کیا گیا تو مولانا شبلی نے اس پر پرزور تنقید کرتے ہوئے کہا کہ: ''ہم بتادیں گے کہ قرآن مجید ہزاروں دلائل سے انجیل نہیں بن سکتا۔'' اس ایک جملہ میں اس ذہنی کاوش کا پورا پس منظر سمٹ آیا ہے، جو مستشرقین کی ان کوششوں کا محرک تھا۔ پادری بروچلی نے تعدد ازدواج پر اعتراضات کیے تو مولانا شبلی کا قلم حرکت میں آیا۔ جرجی زیدان کی کتاب تاریخ تمدن اسلام کی پردہ دری کا کام مولانا شبلی نے ہی انجام دیا۔ (۲۱) آرمینا کے جھگڑوں میں مستشرقین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسلام میں عیسائی رعایا کے ساتھ ماضی میں شدید مظالم ہوچکے ہیں اور اسلام میں یہ ظلم جائز بلکہ ضروری قرار دیا گیا ہے۔ مولانا شبلی نے حقوق الزمین اور الجزیہ لکھ کر ان الزام تراشیوں کو بے اثر کردیا۔ جب سیرت النبی پر قلم اٹھایا تو سب سے پہلے مستشرقین کے پیدا کیے ہوئے اثرات کا جائزہ لیا۔ اسی مقصد کے پیش نظر مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۲-۱۹۱۱ء میں الندوہ میں ایک طویل سلسلہ مضامین شائع کیا جن میں مستشرقین

کے کام کا جائزہ لیا گیا ہے۔'' (۲۲)

مستشرقین کے اعتراضات اور پروپیگنڈے کا ایک دوسرا محاذ یہ بھی تھا کہ عیسائی پادری جگہ جگہ پہونچ کر مسلمانوں کے خلاف تقریریں کرتے اور اپنے مذہب کی اشاعت کرتے، اور لوگوں کو دین اسلام سے برگشتہ کرکے مرتد بناتے تھے، جن کے خلاف علماء کی ایک بڑی تعداد کھڑی ہوگئی اور اس کا دندان شکن جواب دیا۔ ان علماء کی خدمات کو سراہتے ہوئے پروفیسر مذکور رقم طراز ہیں:

''ہندوستان میں مستشرقین کے پیدا کیے ہوئے اثرات کے خلاف جن علما نے پیہم جدوجہد کی ان میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا شبلی، مولانا محمد علی مونگیری، ڈاکٹر محمد اقبال اور سید امیر علی کے نام تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیں گے۔ ہندوستان میں مشنری اور مستشرق کی سازش نے نازک صورت حال پیدا کردی تھی۔ میور نے خود لکھا ہے کہ اس نے اپنی کتاب پادری فنڈر کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے لکھی تھی۔ مولانا کیرانوی اور مولانا مونگیری نے مشنریوں اور مستشرقین کے اتحاد عمل کا مقابلہ کیا اور بڑی ہمت واستقلال سے بہت سے فتنوں کا سدباب کیا، مولانا کیرانوی کی کتابیں ازالۃ الاوہام، ازالۃ الشکوک، احسن الحدیث، اظہار الحق فرانسیسی، انگریزی اور ترکی زبانوں میں ترجمہ ہوچکی ہیں۔ مولانا مونگیری کی کتابوں میں پیغام محمدی، ساطع البرہان، برہان قاطعہ وغیرہ نے مشنریوں کی سازش کو ناکام بنایا۔'' (۲۳)

سرجادوناتھ سرکار کا جھوٹ:

فرقہ پرستی کی آگ بھڑکانے میں ہندوستانی مؤرخ سرجادوناتھ سرکار بھی انگریز مؤرخوں کی صف میں برابری کا درجہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے اورنگ زیب کے نام سے ۵/جلدوں میں کتاب لکھ کر بڑا نام کمایا۔ اجہاں انہوں نے ایک طرف اورنگ زیب کے حالات، افکار، ملکی نظم ونسق، علم اور علماء پروری اور کارناموں کو بڑے دل کش انداز میں بیان کیا ہے وہیں بعض جگہوں پر اسلام، مسلمان اور اورنگ زیب کے عادات وخصائل پر جارحانہ حملے بھی کیے ہیں۔ اس نے اپنی کتاب کی جلد سوم کا ایک پورا باب ''اسلامک اسٹیٹ چرچ'' کو اس بحث کے لیے وقف کردیا ہے کہ اسلام ایک وحشیانہ مذہب ہے، جو اپنے متبعین کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ لوٹ مار اور خوں ریزی کو مذہبی

فرض سمجھو، یہ دنیا کے امن کا دشمن ہے اور اس کی رو سے رواداری ناجائز ہے، حکومت مغلیہ مکمل قزاقی تھی، مسلمانوں کی حکومت میں غیر مسلم ابھر نہیں سکتے تھے، اورنگ زیب کی عدم رواداری کا ذمہ دار اسلام تھا، کیوں کہ وہ شجر اسلام کا ایک پھل تھا، جب درخت ہی کڑوا ہے تو پھل لامحالہ کڑوا ہوگا۔ (۲۴)

جیسا کہ اس کتاب کی زہر افشانی کے متعلق ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد لکھتے ہیں:

''دوسری کتاب مشہور تاریخ داں جادو سرکار (سر جادو ناتھ سرکار) کی لکھی ہوئی ہندی اور انگریزی زبانوں میں موجود ہیں، ویسے سر کا خطاب انگریزوں نے زیادہ تر ایسے ہی لوگوں کو دیا، جنہوں نے انگریزوں کے خیالات و بہبودی کا خیر مقدم دل کھول کر کیا۔ جادو ناتھ سرکار کی کتاب پڑھنے پر ہمیں بڑی دل چسپ باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ سرکار صاحب کوئی ایسا قدم اٹھانے سے بعض نہیں آتے ہیں، محض یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اورنگ زیب مغلیہ عہد کا بدترین بادشاہ تھا۔ جب کہ ہمیں انہیں کی کتاب میں اورنگ زیب سے متعلق ایسی باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں جن پر غور کرنے سے ہم آسانی سے اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں کہ وہ اتنا کٹر، ظالم اور متعصب نہیں تھا جتنا بتایا گیا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے اگر ہم سرکار صاحب کی کتاب میں شائع اورنگ زیب کے فرمانوں کا مطالعہ کریں تو بات کافی حد تک سمجھ میں آسکتی ہے۔'' (۲۵)

دیگر مؤرخین کا مثبت اور منفی نقطہ نظر:

ان کے علاوہ ایشوری پرساد، سری رام شرما، آشروادی لال وغیرہ نے مغل بادشاہوں کی مذہبی پالیسی اور میڈول انڈین کلچر کے نام سے عہد وسطیٰ کے بادشاہوں کی تاریخ لکھی، ان میں بھی کہیں کم اور کہیں زیادہ بیشتر حکمرانوں کی سیاسی و مذہبی پالیسی کو تنقیدی انداز میں موضوع بحث بنایا گیا ہے اور اسی کے ضمن میں پورے اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کی گئی ہے یہ کہتے ہوئے کہ اسلام کو پھیلانے کے لیے جبر و تشدد کی پالیسی اپنانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ (۲۶)

اس کے برعکس ڈاکٹر ستیش چندر کی کتاب ''مغل دربار کی گروہ بندیاں اور ان کی سیاست'' محمد اطہر علی کی ''اورنگ زیب کے عہد میں مغل امراء''، ''تاریخ شاہ جہاں'' ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ کی

اور رومیلا تھاپر کی کتاب کافی حد تک حقائق پر مبنی معلوم ہوتی ہیں، جن میں سلاطین ہند کی ہندو نوازیت اور دوسرے اہم گوشوں پر منصفانہ مواد جمع کر کے ان متعصب مؤرخوں کا بھانڈا پھوڑا گیا ہے۔

اس قسم کا زہریلا لٹریچر عوام کے سامنے آیا تو بلا تفریق مذہب وملت کچھ سیدھے سادے لوگ بھی ان سلاطین کو نفرت کی نگاہ سے دیکھے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے اندر بھی غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ آج بھی تاریخ کے بعض طالب علموں کے ذہنوں سے یہ غلط تأثر زائل نہ ہوسکا ہے۔ ان میں سے بھی کچھ طالب علم تحقیق وتخریج کے میدان سے گزرتے ہیں تو انہیں اصل صورت حال کا اندازہ ضرور ہوجاتا ہے، پھر بھی شک اور تعجب کا خاور بند نہیں ہوتا۔ ان کتابوں میں بالخصوص الیٹ کی تاریخ نے عوام کے ذہن میں ایسا تأثر پیدا کیا ہے کہ آج بھی جب اس کے خلاف کوئی بات کہی جاتی ہے تو وہ شک آمیز اور تعجب سے سنی جاتی ہے۔

معترضین کے اعتراضات کی کمزوری خود ان کی اور دوسرے ہندو مؤرخین کی زبانی:

اس مختصر حقیقت پسندی کے علاوہ یہاں پر اور دوسرے منصفانہ بیانات خود معترضین اسلام اور دوسرے ہندوں مؤرخوں کی تحریر کی روشنی میں تحریر کیے جاتے ہیں جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آخر ان فرماں رواؤں کا رویہ اپنی رعایا کے ساتھ ایک ہی وقت میں متضاد کیوں کر ہوسکتا ہے۔ یا تو انہوں نے ہندوستان میں ظلم وبربریت کی روش اختیار کی ہوگی۔ یا پھر انسانی ہمدردی اور رواداری کے اصولوں کو اپنایا ہوگا۔ لہٰذا ان بیانات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان بادشاہوں کے متعلق بیشتر مؤرخوں نے تعصب سے کام لے کر پوری تاریخ کو مشکوک بنادیا ہے۔ چنانچہ جس اورنگ زیب کو سر جادوناتھ سرکار نے شجر اسلام کا ایک کڑوا پھل کہا ہے اس کی دوسری رائے اورنگ زیب کے متعلق یہ بھی ہے:

> ''جسمانی ہمت اور تمکنت کے علاوہ اس نے اوائل زندگی ہی سے بادشاہت کی مشقتوں اور خطروں کو اپنا شیوہ بنالیا تھا اور اس عظیم الشان عہدہ کے لیے احترام ذات اور ضبط نفس سے اپنے کو تیار کرلیا۔ بادشاہوں کے لڑکوں سے بالکل مختلف اورنگ زیب ایک وسیع النظر اور سلیم الفطرت عالم تھا اور زندگی کی آخری سانس تک کتابوں سے محبت کرتا رہا۔ اگر ہم قرآن شریف کے ان متعدد نسخوں کو نظر انداز بھی کردیں جن کو اس نے اپنے ہاتھوں سے ایک عابد کی سرگرم ریاضت کے ساتھ

لکھا تو بھی ہم اس کو فراموش نہیں کر سکتے کہ وہ ایک مشغول حکمراں ہونے کے باوجود اپنی قلیل فرصت کو عربی کی فقہی اور مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں شوق سے گزارتا اور پرانے اور نادر مخطوطات مثلاً نہایہ، احیاء العلوم اور دیوان صائب کو کتابوں کے ایک کاہل عاشق کی ہوس سے ڈھونڈتا۔ اس کے کثرت رقعات، اس کی فارسی شاعری اور عربی ادب پر قدرت کی دلیل ہے، کیوں کہ وہ ہمیشہ اپنے خط کو مناسب اشعار و اقتباسات سے مزین کرتا ہے۔ عربی اور فارسی کے علاوہ ترکی اور ہندی بھی آزادی کے ساتھ بول سکتا تھا۔ یہ اسی کی جودت طبع اور سرپرستی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے پاس ہندوستان میں مسلمانوں کے قانون کا سب سے بڑا خلاصہ فتاویٰ عالم گیری ہے جو نہایت مناسب طور پر اسی کے ساتھ منسوب ہے اور جس نے بعد کے عہد میں اسلامی نظام عدل کو واضح طور پر آسان کر دیا۔'' (۲۷)

یہی مؤرخ محمد بن قاسم کی فتوحات اور ان کی سیاسی بصیرت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''شروع کے عرب فاتحوں، خصوصاً سندھ کے فاتحوں نے یہ عقلمندانہ اور مفید حکمت عملی اختیار کر رکھی تھی کہ وہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں اور مذہبی مراسم کو مطلق نہ چھیڑتے۔ جب وہ کسی شہر پر قبضہ کر لیتے تو وہاں غیر مسلم آبادی کو اسلام قبول کرنے کو کہتے، اگر وہ قبول کر لیتے تو ان کو وہی حقوق حاصل ہو جاتے جو فاتحوں کے ہوتے، ورنہ پھر ان کو جزیہ ادا کرنا پڑتا، جس کے بعد ان کو اپنے مذہب کے مراسم ادا کرنے کی اجازت ہوتی۔'' (۲۸)

سر جادوناتھ مجموعی طور پر تمام مغل حکمرانوں کی پالیسی اور ان کے انتظام مملکت کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''مغل ایمپائر کے سبھی صوبوں پر بالکل ایک ہی طرح انتظامی مشنری کے ذریعہ ٹھیک ایک ہی طرح کے ضابطوں اور سرکاری خطابوں کے ساتھ حکومت ہوتی تھی۔ فارسی واحد زبان تھی جو سرکاری ریکاڈس، فرمان، اسناد، زمینوں کے عطیات، حمل و نقل کے اجازت ناموں، مراسلات اور رسیدوں کے اجرا میں استعمال ہوتی تھی۔ صرف ٹکسال شہروں کے ناموں کے فرق کے ساتھ ایک ہی نام اور نوعیت کے اور کھرے پن میں ایک ہی طرح کے اسکولوں کا حامل، ایک ہی طرح کا مالیاتی نظام سلطنت بھر

میں رائج تھا۔عہدہ داروں اورفوجیوں کو برابر ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں تبدیل کیا جاتا تھا۔اس طرح ایک صوبہ کا باشندہ اپنے کو کسی دوسرے صوبے میں تقریباً گھر ہی کی طرح مطمئن محسوس کرتا تھا۔تجاراورسیاح بڑی آسانی سے ایک شہر سے دوسرے شہراورایک صوبے سے دوسرے صوبے میں آتے جاتے رہتے تھےاور سبھی اس ملک کی شاہی (سیاسی) وحدت کوخوب سمجھتے تھے۔''(۲۹)

کیمبرج ہسٹری کے مصنف نے اپنی دوٹوک رائے اس انداز میں پیش کی ہے:

''مسلم مؤرخین نے کسی بغاوت کوفرو کرنے یا کسی قلعہ،شہر یا گاؤں پر قبضہ کرنے میں انہیں جلانے اور پورے ضلع کو برباد کردینے کا واقعہ اس رجزیہ انداز میں کیا ہے کہ اگر ہمارے پاس ثبوت نہیں ہوتا کہ واقعہ اس طرح ہو ہی نہیں سکتا تو ہم مغالطہ میں پڑ جاتے اور یقین کرنے لگتے کہ شمالی ہندوستان پر مسلمان کا ابتدائی غلبہ ایک ایسا مقدس جہاد تھا جو بت پرستی کوختم کرنے اوراسلام کی تبلیغ کے لیے شروع کیا گیا تھا۔محمود اور اس کے بعد سبھی حکمرانوں نے جب بھی ایسا کرنا چاہا اپنے حق میں موزوں سمجھا۔ ہندو جاگیرداروں اورزمین داری کی اطاعت کوقبول کرلیا،انہیں اپنا منصب دار بنایااوران کے موروثی علاقوں کوان کے قبضے میں رہنے دیا۔''(۳۰)

الفسٹن جس کی تاریخ کا اس باب میں ذکر ہوا ہے کہ اس نے ''پھوٹ ڈالواورحکومت کرو'' کی پالیسی اپنائی تھی اور مسلمانوں کو ہندوؤں کا اور ہندوؤں کو مسلمانوں کا حریف ٹھہرا تھا اور پھر اپنے نظریات کو کتابی شکل دے کر اسکول کے نصاب میں شامل کردیا۔مگر وہ بھی دانستہ یا نادانستہ مسلمان حکمرانوں کے انصاف ،مواخات اور رواداری کا اعتراف کرتے ہوئے نہیں چوک سکے۔چنانچہ مؤرخ مذکورایک مقام پرلکھتا ہے:

''ان کی (مسلمانوں) حکومتوں میں ہندوؤں کے مندروں اور دھرم شالاؤں کی حفاظت کی جاتی تھی۔ برندابن، گوردھن اورمتھرا کے مندروں کوشاہی خزانے سے مدد کی جاتی تھی۔متھرا ضلع کے گوردھن میں ہری دیو کا مندر ہے جو ۱۵۰۰ء میں بنا۔احمد شاہ کے ایک دستخطی فرمان سے معلوم ہوتا کہ بادشاہوں کی طرف سے مندر کے خرچ کے لیے روپیہ ملتا تھا۔''(۳۱)

ڈاکٹر ایشوری پرساد سابق پروفیسر الٰہ آباد یونیورسٹی محمود کی عسکری اورسیاسی بصیرت کی

وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تاریخ میں محمود کا مقام طے کرنا مشکل کام نہیں، اپنے زمانے کے مسلمانوں کے سامنے وہ غازی اور دین کا حمایتی تھا، جس نے مشرکوں کے ملک سے بت پرستی ختم کرنے کی کوشش کی اور آج کے ہندوؤں کی نگاہ میں وہ ایک وحشی اور ظالم حقیقی ہوا تھا، جس نے ان کی انتہائی مقدس عبادت گاہوں کو برباد اور وحشیانہ طور پر ان کے مذہبی احساسات کو مجروح کیا، لیکن ایک غیر جانب دار محقق جو اس زمانے کے خصوصی حالات کو دھیان میں رکھے گا تو لازمی طور پر دوسرا فیصلہ دے گا۔ محمود بلاشبہ اپنے ساتھیوں کا ایک عظیم رہنما تھا، وہ اپنی عقل سے کام کرنے والا معقول اور ایمان دار حکمراں، ایک جری اور لائق سپاہی، منصف مزاج، ادب کا سرپرست اور دنیا کے سب سے بڑے بادشاہوں میں شمار کیے جانے کے لائق تھا۔'' (۳۲)

ہندوؤں کے مذہبی مقامات کے لیے اوقاف سے متعلق سلاطین ہند کے فرامین:

سلاطین ہند نے غیر مسلموں کے ساتھ جو رواداری برتی اور ان کے مذہبی مقامات کے سلسلے میں جو مثبت رویہ اپنایا وہ کسی بھی طرح مشکوک نہیں ہے۔ اس کے علاوہ مسلم فرماں رواؤں نے اپنی سلطنت میں غیر مذہب والوں کے عبادت خانوں کے لیے بڑی تعداد میں اراضی وقف کردیے، تاکہ اس کی آمدنی سے مذہبی مقامات کا نظم ونسق اچھی طرح انجام پاسکے۔ اورنگ زیب نے تو کچھ مندروں کے لیے گھی اور تیل بھی مہیا کرایا، تاکہ شام ہوتے ہی ان جگہوں کو روشن کیا جائے۔ (۳۳) ایسے فرامین کی تعداد بہت ہے جو ملک کے مختلف مقامات کے مندروں کے پروہت اور ان کے اہل خاندان کے پاس آج بھی پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے فرامین کو بسمبر ناتھ پانڈے نے مختلف جگہوں سے حاصل کرکے اور بڑی چھان بین کے بعد اسے اپنی کتاب میں شائع کردیا ہے۔ (۳۴) اس سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ اسی طرح کتاب ''تاریخ ہند عہد وسطی میں'' بھی ان فرامین کو عہد بعہد بالترتیب جمع کیا گیا ہے جو مندروں سے متعلق ہیں۔ (۳۵) اس کے علاوہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی لائبریری کے شعبہ مخطوطات اور خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ میں کئی فراہین موجود ہیں۔ ان فرامین کے مطالعہ سے متعصب مؤرخوں کا تعصب واضح ہوجاتا ہے اور ان برادران وطن کے لیے لمحہ فکریہ ہے جو مسلمان فرمارواؤں کو

بدنام کرتے اور انہیں ظالم و جابر کہنے میں ذرہ برابر بھی عار محسوس نہیں کرتے۔

اسلام میں عبادت خانوں کے انہدام کی ممانعت:

شروع میں لکھا جاچکا ہے کہ قرآن نے کسی قوم کے مذہبی مقامات پر بے وجہ حملہ کرنے کی سختی سے ممانعت کی ہے اور اللہ کے رسول ﷺ نے اہل ایمان کو اس کام سے روکا ہے۔ صحابہ کرام اور بعد کے خلفاء نے بھی انہی اصولوں پر عمل کیا۔ محض تعصب کی بناء پر غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کو مسمار کرنے کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ عبادت گاہیں خلفائے اسلام کے حکم سے منہدم کی گئیں، مگر ان کے پیچھے کسی نہ کسی اہم عوامل کارفرما تھے۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی اس قسم کے واقعات رونما ہوئے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی قباحت نہیں کہ سلاطین ہند گو کہ پوری طرح سیاسی معاملات میں شریعت پر عمل نہیں کرتے تھے، تاہم جب دو قوموں کے درمیان تصادم وامتیاز کا مسئلہ آتا تو اس سلسلے میں علماء وفقہا سے رائے طلب ضرور کرتے تھے، وہاں سے جو جوابات ملتے ان پر بادشاہ عمل کرتا یا نہ بھی کرتا۔ اگر سیاسی معاملات میں علماء کی رائے سے حکومت کے کام میں خلل واقع ہوتا تو وہ اسے پس پشت ڈال دیتے تھے، اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس باب میں سلاطین ہند نے شرعی اصول پر عمل کیا، کیوں کہ ایسا نہ کرتے تو ملک میں خلفشاری ہوتی اور خود بادشاہ کی دیانت داری نہ ہوتی، اور وہ اتنے طویل عرصہ تک ہندوستان میں اس شاندار طریقے سے حکومت کرنے میں ہرگز کامیاب نہ ہوتے۔

یہ بھی ایک بڑا طرفہ تماشہ ہے کہ آج ملک میں برادران وطن تعصب کی بنا پر جس مسجد پر اپنا قبضہ جمانا چاہتے ہیں یا اس کے منہدم کا منصوبہ تیار کرتے ہیں تو بڑے زور وشور سے پہلے اس بات کی تشہیر کرتے ہیں کہ فلاں مقام پر جو مسجد ہے پہلے وہاں پر مندر تھا اور فلاں بھگوان کی مورتی تھی، بادشاہوں نے اسے توڑ کر مسجد بنالیا اور دھیرے دھیرے یہ مسئلہ اتنا طول پکڑتا ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوجاتے ہیں۔ جب معاملہ عدالت میں پہونچتا ہے تو فیصلہ حقیقت کے برعکس ہوتا ہے یا پھر اسے طول دے کر معاملہ کو دبا دیا جاتا ہے اور وہاں پہرے بٹھا دیے جاتے ہیں۔ اس طرح مسجد مسلمانوں کے تصرف سے نکل جاتی ہے۔ حالاں کہ فقہا نے کسی مقام پر مسجد بنانے کے جو حدود وقیود متعین کیے ہیں اس کی تفصیل یہاں بیان کردینا دلچسپی سے خالی نہیں۔ فقہائے اسلام نے صراحت کی ہے کہ:

''اگر کوئی شخص مسجد بنائے جس میں دوسرے کا حق ہو اور اس کی رضامندی حاصل نہیں کی گئی ہو تو اس حق والے کو اختیار ہے کہ ایسی مسجد کو باطل قرار دے اور اپنا حق لے لے۔ اس کو اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک زمین پر کسی کو جوار یا حق شفعہ حاصل ہے تو اس پر مسجد نہیں بنائی جاسکتی۔ اسی طرح ایک شخص بیمار ہے یا اس کی خواہش ہے کہ وہ اپنا گھر بار مسجد میں تبدیل کردے یا اس نے مرتے وقت اس کی وصیت بھی کردی، مگر اس کے جائز ورثاء وصیت کو تسلیم نہ کریں تو اس کی وصیت جائز نہیں سمجھی جائے گی۔ اسی طرح بیع فاسد سے خریدی ہوئی زمین پر مسجد بنانے کی اجازت نہیں۔ ناجائز طریقے سے حاصل کی ہوئی زمین پر بھی مسجد بنانا درست نہیں ہے۔ ناجائز حصول کی جو بھی شکل ہو، مثلاً کسی کا گھر زبردستی کچھ لوگ حاصل کرکے وہاں مسجد یا جامع مسجد بنالیں تو ایسی مسجد میں نماز پڑھنا جائز نہ ہوگا۔ اسی طرح کوئی راستہ ایسا ہو کہ ایک مسجد کے بننے سے چلنے والوں کو نقصان یا تکلیف ہو تو بلاشبہ ایسی مسجد بنانا درست نہیں۔ مسجد کی تعمیر کے لیے زمین کو حلال طریقے سے حاصل کیا جانا اس کی صحت کی شرط ہے اور اس حلال طریقہ کی وضاحت اس طرح کی جاتی ہے کہ اس زمین پر کسی بھی شخص کا کوئی حق نہ ہو۔''(۳۶)

انہدام منادر کی حقیقت:

مسلمان حکمرانوں پر مندر شکنی کا الزام لگایا جاتا ہے اور اس سے متعلق واقعات کو بیان کرنے میں جس مبالغہ آرائی سے کام لیا جاتا ہے اور ایک طویل عرصہ سے خاص اسی مسئلہ کو اچھالنے کی جو مہم چھیڑی گئی ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہ گئی ہے۔ کچھ معاصر مؤرخین کے مبالغہ آمیز اور غیر محتاط بیانات کی وجہ سے جو غلط تأثرات ابھرتے ہیں ان سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن بعد کے دور میں برطانوی مؤرخین اور خود ہندوستانی مؤرخین واہل قلم کے ایک طبقہ نے اس زمانہ کے مزاج یا درباری مؤرخین کے انداز تحریر کو دانستہ یا نادانستہ اس باب میں مسلم حکومتوں کے طرز عمل کی جو ترجمانی کی ہے، یا اس سے متعلق واقعات کو جس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے وہ نہ صرف علمی بددیانتی اور تاریخ کو مسخ کرنے کی بدترین مثالیں ہیں بلکہ ملک میں سماجی تعلقات اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے بھی بہت خطرناک ثابت ہو رہے ہیں۔ ایسے مؤرخین کے بیانات کو پڑھ کر کوئی نتیجہ

اخذ کرے تو غلط نہ ہوگا کہ یہی اس زمانہ کی حکومت کا یک نکاتی پروگرام تھا۔ جب کہ صحیح بات یہ ہے کہ اگر ان مناد رکو منہدم نہ کیا جاتا تو ملک میں مزید بے حیائی اور بدامنی وخلفشاری پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ کیوں کہ اس عہد میں ایسے کئی مندر تھے جو بے حیائی کا اڈہ بن گئے تھے اور مفسد لوگ یہاں جمع ہوکر حکومت کے خلاف سازشیں کرتے تھے۔ جیسا کہ ڈاکٹر ایشور ٹوپا کے اس اظہار میں صداقت نظر آتی ہے:

''اسلامی اصولوں کے نقطہ نظر سے غیر مسلم ذمی کو یہ اختیار حاصل نہ تھا کہ وہ نئے مندر نو آباد مسلمانی علاقوں میں تعمیر کرتے۔ فیروز شاہ نے تغلق پور، صالح پور اور کوہانہ نئے شہر آباد کیے تھے، یہاں ہندوؤں نے مندر بنائے۔ یہ مندر فیروز شاہ کے حکم سے توڑے گئے۔ ان مندروں کے متعلق فتوحات فیروز شاہی میں تفصیلی حالات ملتے ہیں، اس میں لکھا ہے کہ ہندو اور مسلمان تیوہاروں کے موقعہ پر جوان مندروں کے سلسلے میں ہوا کرتے تھے، جاتے تھے اور عورتوں کا بھی کثرت سے ان جگہوں میں آنا جانا ہوتا تھا۔ مرد اور عورت کے ملنے جلنے کی وجہ سے پبلک میں عام رسوائی کے چرچے ہوا کرتے تھے اور بداخلاقی پھیلی جاتی تھی۔ یہ مندر دراصل عقیدت اور مذہبیت کے گھر نہ بن سکے بلکہ شیطان کا وہاں راج تھا۔ فیروز شاہ نے ایک طرف اسلامی قانون کے تحت اور دوسرے پبلک کی بھلائی کے پیش نظر ان مندروں کو توڑا۔ فیروز شاہ نے عام طور سے بحیثیت سرکاری پالیسی کے مندر توڑے۔''(۳۷)

اس طرح کے واقعات دوسرے عہد میں بھی ہوئے جس کے خلاف بادشاہ کو سخت کاروائی کرنی پڑی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ: جنگ کے دوران عبادت گاہوں کی بربادی ایک عام بات تھی۔ لیکن جب صلح کی صورت پیدا ہوجاتی تو ان عبادت گاہوں کی تخریب سے ہاتھ روک لیا جاتا۔(۳۸)

سلطان سکندر لودھی بھی مذہبی معاملات میں سخت واقع ہوا ہے، مگر اس نے تعصب سے کام نہیں لیا۔ اگر اس نے کسی قدر غیر مسلموں کے ساتھ سخت رویہ اپنایا تو اس کے عوامل پر بھی غور کرنا چاہیے۔ اس عہد میں ہندوؤں کی بعض ایسی تبلیغی جماعتیں سرگرم ہوگئی تھیں جن کا مقصد مسلمانوں کو مرتد بنانا تھا۔(۳۹) دوسری طرف یہی بادشاہ یہ بھی چاہتا تھا کہ دونوں قومیں ایک دوسرے کے علوم کو سیکھیں تاکہ اس ایک دوسرے کو قریب سے سمجھ سکیں۔(۴۰) اس نے اگر تعصب

سے کام لیا ہوتا تو کروکیشتر کے کنڈ کو تباہ کر دیتا، مگر مولانا عبداللہ اجودھنی نے انہیں اس کام سے روکا تو وہ آگے کوئی اقدام نہ کرسکا۔ (۴۱)

جن علاقوں کو مسلمانوں نے آباد کیا اور وہاں ہندو پہلے سے موجود نہ ہوں اور بعد میں آکر بسے ہوں تو ان علاقوں میں غیر مسلم سلطان وقت کی اجازت کے بغیر اپنے لیے کوئی عبادت خانہ تعمیر کرتا ہے تو بادشاہ کو اختیار ہے کہ وہ اسے چاہے تو رہنے دے یا منہدم کردے۔ (۴۲)

حضرت مجدد الف ثانی نے جہاں گیر سے یہ وعدہ وعید کرایا تھا کہ وہ ہندوؤں کے زور کو توڑے اور اس کی تذلیل وتحقیر کرے، جس کی وجہ سے بادشاہ نے کچھ سخت اقدام کیا، اس سے مجدد کی مراد ہرگز یہ نہ تھی کہ عام حالات میں ایسا کیا جائے، بلکہ کفار کے زور کو توڑنے کے لیے ایسا کرنے کو کہا تھا، کیوں کہ کفار دن بدن نڈر ہو رہے تھے۔ (۴۳) بعض وجوہ کے بنا پر جہاں گیر نے نئے مندر کی تعمیر پر پابندی لگادی تھی، اس لیے شاہ جہاں نے اپنے زمانہ میں نوتعمیر شدہ مندروں کو مسمار کروادیا تھا۔ اورنگ زیب نے بھی کئی مندر گروائے۔ مسلمان حکمرانوں نے ہنگامی حالات میں مندروں کو مسمار کیا تو انہوں نے اپنی مسجدوں کو بھی نہیں چھوڑا اور درگاہوں کو بھی تہس نہس کیا۔ اگر وہ تعصب کو جگہ دیتے تو ملک میں ایک بھی مندر بچا نہ رہتا۔

محمد بن قاسم نے جس فراخ دلی سے مندروں کی تعمیر اور اسکی مرمت کی اجازت دی، اور عطیات بھی عطا کیے، وہ اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے اسلام کی اس اصول پر عمل کیا کہ کسی کے مذہبی مقامات کو محض نفرت اور عناد کی وجہ سے ہرگز ہرگز مسمار نہ کیا جائے۔ البتہ جو مقامات سازش اور گمراہی کے اڈے ہوں اسے برباد کردیا جائے۔

جب دونوں قوموں کے ذریعہ انہدام معابد کے واقعات کا موازنہ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں نے ہی جو ذمی کی حیثیت سے مسلمانوں کی عمل داری میں رہتے ہیں، بیشتر مساجد کو مسمار کیا ہے۔ چنانچہ ایک انگریز مؤرخ کا تبصرہ بجا معلوم ہوتا ہے:

> ''عرب فاتح جو رویہ ماتحت قوموں کے ساتھ برتتے تھے ہندوستان میں آکر بالکل پلٹ گیا، ہندوؤں کے مندروں کو جیوں کا تیوں چھوڑ دیا گیا اور بت پرستی پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔ ہندوستان کی لڑائی دھرم یدھ یا جہاد نہیں رہ گئی کیوں کہ مذہب بدلنے کا وہاں سوال ہی نہیں اٹھایا گیا۔ سندھ میں اللہ کی عبادت کے ساتھ ساتھ بتوں کی بھی پوجا کی جاتی تھی اور اس طرح باوجود اسلامی حکومت کے بھارت

ایک بت پرست ملک بنا رہ گیا۔'' (۴۴)

جزیہ کی شرعی حیثیت اور اس کا نفاذ ہندوستانی تناظر میں:

جب کسی نئے علاقہ کو فتح کر کے مسلمان اس پر اقتدار حاصل کرلیں تو مفتوحین میں سے جو لوگ مسلمانوں کی حکومت تسلیم کر کے اس ملک میں رہنا چاہیں اور عہد کریں کہ وہ مملکت کے خلاف بغاوت اور سازش میں ملوث نہ ہوں گے تو اب حکومت کے لیے ناگزیر ہوجاتا ہے کہ ان مفتوحین کو ذمی کی حیثیت سے تسلیم کر کے اس کے جان و مال اور عزت وآبرو کی بالکل اسی طرح حفاظت کرے جس طرح وہ مسلمان رعایا کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ (۴۵) اب اگر کوئی بلاوجہ اس کو قتل کرتا ہے تو اس کے عوض اسے بھی قتل کیا جائے گا، اور اگر مقتول کے ورثاء اپنی مرضی سے قاتل کو معاف کردیں تو قاتل بری ہوجائے گا۔ البتہ ایسے لوگوں سے مسلمان حکمراں کچھ سالانہ ٹیکس (جزیہ) لینے کے مجاز ہوں گے۔ یہ ٹیکس انہی لوگوں سے وصول کی جائے گی جو فوجی خدمت کے قابل ہوں، عورت، بچے، بوڑھے، معذور اور مذہبی خدام لونڈی اور غلام اس سے مستثنیٰ قرار دیے جائیں گے۔ (۴۶) جزیہ کی ادائیگی کے بعد اہل ذمہ سے نہ صرف فوجی خدمات ساقط ہوجائیں گے، بلکہ وہ اپنے مذہبی، سماجی اور عائلی معاملات میں بھی اسلامی قانون کے پابند نہ ہوں گے۔ (۴۷) البتہ وہ مسلم علاقوں میں کوئی نئی مذہبی عبادت گاہ تعمیر نہیں کرسکتے۔ پرانی عبادت گاہوں کی مرمت اور خستہ مذہبی مقامات کی دوبارہ تعمیر کرسکتے ہیں اور جہاں صرف غیر مسلم ہی رہتے ہوں تو پھر نئے مندر بھی اپنی مرضی سے قائم کرلیں تو مضائقہ نہیں۔ (۴۸) اسی طرح وہ مسلم علاقوں میں رہ کر مذہب سے متعلق کوئی ایسا کام نہیں کرسکتے جس سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی ہو اور اس کے مذہبی معتقدات کو ٹھیس پہونچتی ہو۔ (۴۹) اگر وہ اپنی مرضی سے اپنے نزاعی معاملات کے لیے شرعی عدالت سے رجوع کریں تو فیصلہ شرع کے مطابق کیا جائیگا۔ (۵۰) کسی معاہد پر بھی شرعی نقطہ نظر سے کوئی ظلم وزیادتی نہیں کی جائے گی اور نہ مسلمان کسی اہم سبب کے معاہدہ کو توڑ سکتے ہیں۔ جب تک کہ فریق ثانی کی رضامندی حاصل نہ ہوجائے۔ معاہدہ خواہ اہل کتاب سے کیا جائے یا مشرکوں سے دونوں صورتوں میں مسلمانوں پر اس کی پابندی اور حفاظت یکساں لازمی ہے۔ (۵۱)

ہندوستانی تناظر میں یہ مسلہ سب سے پہلے محمد بن قاسم کے زمانہ میں پیش آیا، جب وہ سندھ میں اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈال رہے تھے، کہ مفتوح قوم کے ساتھ کس طرح کا معاملہ

کیا جائے اور شریعت کا اس بارے میں کیا حکم ہے، کیوں کہ یہاں کے باشندے شبہ اہل کتاب تھے۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی لکھتے ہیں:

''غیر مسلموں کے شرعی حیثیت کے بارے میں یہ مسئلہ سب سے پہلے محمد بن قاسم کے زمانہ میں پیش آیا۔ وہ اس وقت سندھ میں عربوں کی حکومت قائم کررہے تھے۔ تاریخ سندھ کے ایک مستند ماخذ چچ نامہ کے بیان کے مطابق محمد بن قاسم نے سندھ کے ان مفتوحین (جن میں برہمن، بودھ دونوں شامل تھے) کو ذمی کی حیثیت سے تسلیم کیا اور ان پر جزیہ عائد کیا، جنھوں نے اپنے قدیم مذہب پر قائم رہتے ہوئے مسلم حکومت کے زیر نگیں رہنے پر رضامندی ظاہر کی۔ اسی حیثیت سے انہیں مذہبی آزادی ملی اور قدیم منادر کی مرمت وآبادکاری کی اجازت دی گئی۔ گرچہ چچ نامہ یا کسی اور ماخذ میں اس کی صراحت نہیں ملتی، لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ محمد بن قاسم نے والی عراق اور علماء سے صلاح ومشورہ کے بعد ہی ہندوؤں کے سلسلہ میں فیصلہ کیا ہوگا۔ جیسا کہ اس بات کے واضح ثبوت ہیں کہ انہیں قدیم معابد کی مرمت کی اجازت دینے اور بعض دوسرے مسائل میں محمد بن قاسم نے حجاج بن یوسف سے مشورہ اور علماء سے استفسار کیا تھا۔ یہاں یہ وضاحت دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ مشہور عرب مؤرخ بلاذری نے صاف طور پر یہ ذکر کیا ہے کہ سندھ کی فتح کی مہم کے دوران اور بعد کے زمانوں میں بھی حجاج بن یوسف سے محمد بن قاسم کی مراسلت برابر جاری رہی اور یہ صراحت بھی ہے کہ ہر تیسرے روز خطوط کی آمد ورفت ہوتی رہتی تھی۔'' (۵۲)

سندھ کے غیر مسلموں کی جو شرعی حیثیت متعین کی گئی، اسی قانون پر بعد کے سلاطین نے بھی عمل کیا، اور ہندوؤں سے جزیہ وصول کیا جاتا رہا۔ البتہ اکبر کے زمانہ کے شروع میں تو اس پر عمل رہا مگر بعد میں اس نے ہندوؤں کو اس سے بری کردیا۔ عہد جہاں گیر اور شاہ جہاں میں بھی جزیہ معاف رہا۔ البتہ اورنگ زیب نے اپنی حکومت کے بائیس سال بعد اس قانون کو نافذ کردیا اور اپنے انتقال سے کچھ عرصہ قبل اسے موقوف کردیا۔ اسلام کے اصول جزیہ پر جو لوگ اعتراض کرتے ہیں، اس کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد لکھتے ہیں:

''ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت تقریباً سو سال تک رہی اور زیادہ تر زمانوں میں

جزیہ وصول کیا گیا، اس کے باوجود عہد قدیم سے چلے آئے مذہبی معتقدات اور مذہبی مقامات کی اپنی حیثیت برقرار رہی۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ جزیہ کی وجہ سے بڑے پیمانے پر مذہب کی تبدیلی کا عمل ہوا ہو۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو اسلام کے شیدائی اس کا بیان بڑھا چڑھا کر کرنے سے بعض نہ رہتے۔'' (۵۳)

غیر مسلموں سے سربراہ مملکت سالانہ جزیہ کی ایک قلیل مقدار ہی وصول کرتا تھا، اس کے برعکس مسلمانوں کو صدقہ، زکوٰۃ اور عشر ادا کرنا پڑتا تھا، جو جزیہ سے کہیں زیادہ ہوجاتا تھا۔ دراصل جزیہ ایک طرح کا بدل تھا جس کے ادا کرنے کے بعد ذمی تمام پابندیوں سے آزاد ہوجاتے تھے اور ساتھ ہی اس کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری سربراہ مملکت پر عائد ہوجاتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں پر اور کئی اہم ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں۔ ایک تو انہیں جنگ میں حصہ لینا پڑتا، تو دوسری طرف انہیں سرحد کی حفاظت کرنی پڑتی تھی۔ آج بھی حکومت عوام سے سالانہ ایک متعین رقم وصول کرتی ہے، ملک میں رہنے والی ہر قوم سے۔ تو اس کی کیا توضیح کی جائے گی۔ دراصل اس قسم کی رقم حکومت وصول نہ کرے تو پھر ملک کا نظم ونسق چلانا مشکل ہوجائے گا۔

جزیہ کی جو مقدار متعین کی گئی ہے اور جس کی تفصیل کتابوں ملتی ہے اسی کے مطابق محمد بن قاسم نے ہندو رعایا سے وصول کیا اور اسی اصول پر اورنگ زیب تک عمل ہوتا رہا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ یہ اسلام کی محدثات نہیں ہے۔ اسلام سے قبل بھی اس طرح کی رقم شاہان وقت اپنی رعایا سے وصول کرتے تھے۔ اگر یہ معمولی سا ٹیکس ادا کر کے لوگ تبدیلی مذہب کا شکار ہوجاتے ہیں تو وہ اس کے مذہب کی کمی ہے نہ کہ شاہان اسلام کا جبر۔ چنانچہ علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''اب ہم پوچھتے ہیں کہ ایسا ہلکا ٹیکس جس کی تعداد اس قدر قلیل تھی، جس کے ادا کرنے سے فوجی کو پرخطر خدمت سے نجات مل جاتی تھی، جس کی بنیاد نوشیرواں عادل نے ڈالی تھی۔ کیا ایسی ناگوار چیز ہوسکتی ہے جیسی کہ اہل یورپ نے خیال کی ہے۔ کیا دنیا میں ایک شخص نے بھی اس سے بچنے کے لیے اپنا مذہب چھوڑا ہوگا؟ کیا کسی نے اپنے مذہب کو ایسے ہلکے ٹیکس سے بھی کم قیمت سمجھا ہوگا؟ اگر کسی نے ایسا سمجھا تو ہم کو اس کے مذہب کے ضائع ہونے کا رنج بھی نہ کرنا چاہیے۔ جو لوگ جزیہ ادا کرتے تھے، ان کو اسلام نے جس قدر حقوق دیے، کون حکومت اس سے زیادہ دے سکتی ہے۔'' (۵۴)

نفاذ جزیہ کے سلسلہ میں سب سے زیادہ محمد بن قاسم، علاء الدین خلجی، سلطان فیروز شاہ تغلق اوراورنگ زیب عالم گیر کو موردالزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ کہ ان لوگوں نے زبردستی غیر مسلموں پر جزیہ کا قانون نافذ کیا۔ جس سے ہندوؤں کی مالی حالت کمزور ہوگئی اور مسلمان بحیثیت مال کے مستحکم ہوگئے۔ یہ سب برادران وطن کی غلط فہمی ہے یا ہٹ دھرمی، کہ وہ جزیہ کی اصل غرض وغایت کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ مولانا آزاد کی رائے بالکل درست ہے:

''اورنگ زیب نے باتفاق جمیع علماء حنفیہ ہند ہندوؤں پر جزیہ کے احکام جاری کیے تھے، نادانی و بے خبری سے ہندوؤں نے سمجھا کہ یہ ان کی تذلیل وتحقیر ہے، حالاں کہ اگر اس وقت علماء محققین ہوتے اور وہ جزیہ کی غرض و غایت اوراہل ذمہ کے حقوق معتبر فی الشرع کو کھول کر بیان کرتے تو ہندوؤں کو معلوم ہوجاتا کہ ان کی تذلیل نہیں بلکہ وہ بہتر سے بہتر سلوک ہے جو دنیا میں کوئی حاکم قوم محکوم کے ساتھ کرسکتی ہے''۔(۵۵)

حالاں کہ مسلم حکمرانوں کے عہد میں غیر مسلموں کے درمیان یہ ٹیکس کبھی خلجان کا باعث نہ رہااورنہ ان لوگوں نے اسے اپنے لیے بار سمجھا، بلکہ انہوں نے اسے بخوشی قبول کیا، کیوں کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ اس طرح کے تعاون کے بغیر حکومت کا کاروبار اچھی طرح سے چلایا نہیں جاسکتا۔ جیسا کہ سید صباح الدین عبدالرحمن کی مندرجہ ذیل تحریر سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے:

''اس زمانہ کے تمام راجہ اس کو اور ٹیکسوں کی طرح ایک ٹیکس سمجھ کر ادا کردیا کرتے تھے، اور کسی حال میں وہ اپنے کو کمتر درجہ کا شہری تسلیم نہیں کرتے تھے۔ حالاں کہ اب یہی بتایا جاتا ہے کہ یہ ٹیکس غیر مسلموں کو سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے تابع بنا کر گری ہوئی حالت میں رکھنے کے لیے عائد کیا جاتا تھا۔ مگر جب ہاتھ میں تلوار موجود تھی تو ایسا کرنے کے لیے ٹیکس لگانے کی کیا ضرورت تھی اور ایسے مؤرخ کی کوئی وقعت نہیں ہوگی جو یہ تسلیم نہ کرے کہ ملک گیری کے سلسلہ میں مسلمانوں کی تلوار تو خوب چمکی، لیکن ملک داری میں ان کی تلوار ہمیشہ نیام میں رہی۔ وہ میدان جنگ میں خواہ کیسی ہی خوں ریزی کرتے لیکن جنگ کے بعد معتدل روش اختیار کرلیتے۔ کیوں کہ ملک کی زراعت اور تجارت ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھی۔ اونچے عہدے دار تو مسلمان ضرور تھے، لیکن دوسرے تمام عہدے

ہندوؤں کے ہاتھوں ہی میں ہوتے تھے۔ کیوں کہ ان کی مدد کے بغیر حکومت کا ڈھانچہ کھڑا نہیں ہوسکتا تھا، اور اگر ان کے ساتھ روادارانہ سلوک نہ کیا جاتا تو تھوڑی تعداد اور قلیل فوج کی مدد سے ہر جگہ مسلمانوں کی حکومت قائم نہیں رہ سکتی تھی۔'' (۵۶)

سلاطین ہند نے غیر مسلموں کی نہ صرف طرح طرح سے حوصلہ افزائی کی، بلکہ بحیثیت ذمی ہونے کے سلطنت کے اہم عہدے ان کے سپرد کردیے تھے۔ ناواقف ہندو کہتے ہیں کہ یہ فیاضی صرف اکبر کے ساتھ مخصوص تھی۔ بالکل غلط ہے۔ جہاں گیر، شاہ جہاں یہاں تک کہ اورنگ زیب کے عہد میں بھی ہندو بڑے اہم عہدے پر فائز تھے۔ نہ ہزاری،، ہفت ہزاری، چار ہزاری جیسے عہدے ان کو ملے ہوئے تھے، جو فوجی عہدہ تھا۔ یعنی ہر منصب کے تعداد کے اعتبار سے فوج ان کے زیر نگرانی حرکت کرتی تھی۔ (۵۷)

عہد فیروز شاہی میں بھی ہندو بہت معزز ہوگئے تھے، خود فیروز شاہ تغلق اپنی حکومت کو ہر قسم کے ضعف سے محفوظ رکھنے کے لیے ہندوؤں کو قریب کیا اور بعضے وقت وہ ہندو جوگیوں اور بیراگیوں کو اپنے پاس بٹھاتا اور ان سے علمی مذاکرہ کرتا تھا۔ خسرو خان نمک حرام اور خسرو خانی ہندوؤں نے اندر اندر اسلام دشمنی کا جو مظاہرہ کیا اس پر بھی سلاطین نے کوئی سخت نوٹس نہیں لیا۔ حد سے زیادہ بڑھی ہندو نوازی کا ذکر انگریز مؤرخوں نے بھی کیا ہے۔ پروفیسر گارڈ براؤن نے لکھا ہے:

''رہا ہندو رعایا کے ساتھ برتاؤ سوان پر سختی وسخت گیری کیسی؟ اس نے تو اکبر سے پہلے ہی ایک طرف ستی کے رسم کو مسدود کرایا۔ دوسری طرف ہندو راجاؤں کو اعلیٰ جنگی مناصب اور دیگر قابل ہندوؤں کو اعلیٰ ملکی خدمات پر فائز کرنا شروع کردیا تھا۔ اس نے دولت مند ہندوؤں کی دولت وثروت میں مطلق دست اندازی نہیں کی۔ برنی کا زرفضی پر سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ اس سے ہندوؤں کی دولت مندی وتونگری میں ترقی ہوتی رہی، اس نے (محمد تغلق نے) قدیم وجدید ہندو ریاستوں کو نیم خودمختاری کی حالت میں چھوڑے رکھا۔ اس کے طرز عمل کی دانش مندی سے وہ لوگ تو انکار کر ہی نہیں سکتے جو اکبر کے طرز حکومت کے مداح ہیں۔'' (۵۸)

سلطان شہاب الدین غوری، علاء الدین خلجی اور جلال الدین خلجی کے زمانے میں ہندوؤں نے جو عروج حاصل کیا اس کی تفصیل پچھلے باب میں گزر چکی ہے۔ لیکن یہاں پر شہاب الدین غوری کا یہ واقعہ دعوت ملاحظہ دے رہا ہے کہ: وہ سلطنت کی ہوس میں غیر قوم کو زک پہونچانا جرم

عظیم سمجھتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب وہ انہلواڑہ کے معرکے میں ناکام ہوا تو اسی دوران اس سے کسی نے کہا کہ انہلواڑہ کا فلاں تاجر غزنین میں تجارت کرتا ہے اور اس کی دس لاکھ کی ملکیت کا سامان تجارت غزنین میں پہونچا ہوا ہے، اسے ضبط کر کے خزانہ شاہی میں بھر لیں تاکہ شاہی شان و شوکت میں اضافہ ہو۔ اس کے جواب میں سلطان نے جو جملہ لکھا اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مسلمان سلاطین کس طرح غیر قوم کے ساتھ ہمدردی اور رواداری کا سلوک کرتے تھے:

''وسالہ ابہر کا یہ مال اگر نہروالہ (انہل واڑہ) میں ہوتا اور وہاں اس پر قبضہ کیا جاتا تو ہمارے لیے حلال ہوتا، لیکن غزنین میں اس مال پر قبضہ کرنا ہمارے لیے حرام ہے، کیوں کہ وہ میری پناہ میں ہے۔'' (۵۹)

مسلم حکمرانوں کے اقتدار کے کمزوری کے باوجود اسلام زیادہ پھیلا:

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے باوجود غیر مسلموں نے مسلمانوں پر مظالم زیادہ کیے اور مسلمانوں کی عزت وعصمت پر ڈاکہ ڈالا اور ان کے مذہبی شعائر کے ساتھ توہین آمیز معاملہ کیا۔ اگر ان باتوں پر مسلمانوں نے بعض ہندوؤں کے ساتھ سختی کا معاملہ کیا تو اس پر طوفان کھڑا کرنا چہ معنی دارد۔ چوں کہ غیر مسلموں کی حیثیت ہندوستان میں ذمی کی تھی، اور اگر کوئی ذمی اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ناروا سلوک کرتا ہے تو اسلام اس وقت حکم دیتا ہے کہ ان کی سخت گوش مالی کی جائے۔ مگر سلاطین ہند نے اپنے اسلامی اصول وقوانین پر عمل نہ کر کے ان کے ساتھ بے جا رواداری کا معاملہ کیا۔ ان کے جرائم کو بعضے اوقات نظر انداز کر دیا اور انہیں آزادی سے زندگی بسر کرنے پر مانع ومزاحم نہ ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ہندوؤں نے اسلام قبول کیا۔ اب اگر کوئی معترض ہوتا ہے کہ اسلام جبر سے پھیلا، تو مسلمانوں کی حکومت ہندوستان سے ختم ہوتے ہی وہ سارے کے سارے ہندو جنہوں نے جبراً اسلام قبول کیا تھا اسلام سے پھر جاتے اور اپنے سابق مذہب کو اختیار کر لیتے۔ مگر تاریخ میں ایسے واقعات بہت کم ملیں گے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد بہت سے ہندو بیک وقت اسلام سے منحرف ہو گئے ہوں۔ دو چار واقعات اس قسم کے ضرور رونما ہوئے۔ اس سے اسلام کی کمزوری یا جبر ہرگز ظاہر نہیں ہوتا۔ دراصل یہ وہ لوگ تھے جو جب جاہ اور مالی منفعت کے لیے اسلام قبول کرتے تھے اور اگر جبراً اسلام پھیلایا جاتا تو آگرہ، دہلی، اودھ، بہار، دکن وغیرہ میں مسلمانوں کی تعداد ہرگز کم نہ ہوتی، کیوں کہ یہ علاقے براہ راست مرکز سے

تعلق رکھتے تھے۔ آٹھ سو برس کا عرصہ گزر جانے کے باوجود وہاں پندرہ فیصد سے زیادہ مسلمانوں کی تعداد نہ بڑھی۔ اس کے برخلاف جہاں مسلمانوں کا اقتدار زیادہ مضبوط نہ تھا، ان علاقوں میں مسلمانوں کی تعداد میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہوا۔ سندھ، کشمیر اور بنگال وغیرہ کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ بنگال میں اشاعت اسلام کے سلسلے میں آرنلڈ نے بڑی تفصیلی اور اہم بحث کی ہے۔ مگر یہاں پر ایک دوسرے ہندو مؤرخ کا بیان قول فیصل کا درجہ رکھتا ہے:

''ظن غالب یہ ہے کہ ہندومت کی پابندیوں نے بنگال کی نیچ ذاتوں کو اس نئے مذہب کے قبول کرنے پر آمادہ کردیا تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر بارہویں صدی عیسوی تک بنگال پر پال خاندان کی حکومت تھی جو بدھ کا پیرو تھا۔ اس کے زمانہ میں نیچ ذاتوں کو بڑی آزادی حاصل تھی۔ جب سین خاندان کے لوگ جنوب کی طرف بنگال میں داخل ہوئے تو وہ اپنے ساتھ ہندومت اور اس کی تمام معاشرتی پابندیاں بھی لے آئے، جن سے نیچ ذاتوں کے جذبات کو ہمیشہ ٹھیس لگتی تھی اور جب بارہویں صدی میں اسلام آزادی اور مساوات کا ڈنکا بجاتا ہوا بنگال پہونچا تو عوام کی طبیعتیں خود بخود اس کی طرف مائل ہوگئیں۔ لوگ جوق در جوق مسلمان ہوتے چلے گئے۔ یہ ایک بڑا سبب ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے سبب کی تلاش کی حاجت نہیں''۔ (۶۰)

منصب اور دولت کے لیے تبدیلیٔ مذہب کا عمل:

اسلام قبول کرنے والے صرف نچلی سطح کے لوگ نہ تھے بلکہ اعلیٰ اور اونچی ذات کے لوگوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حلقہ اسلام میں داخل ہوئے۔ وہاں کون سی وجوہات کارفرما تھیں۔ یہ لوگ تو سماج کے ہر قیود سے آزاد تھے۔ دولت تھی، عزت تھی، اور حاکم تھے۔ اس لیے ان کے ساتھ معاشرہ میں کسی ظلم وزیادتی کا کوئی سوال ہی نہیں۔ دراصل ہندوؤں کا ہر طبقہ اپنے اپنے خطوط پر تفریق ذات کے دیو مالائی بلا کا شکار تھا۔ اس کے علاوہ جنگ کے موقع پر لشکروں کی گرفتاری کے ساتھ روسا، جنگ اور امرا، بھی گرفتار ہوتے تھے، چنانچہ سزا سے بچنے کے لیے یہ لوگ اسلام کی طرف مائل ہوجاتے۔ ایک دوسری وجہ یہ تھی کہ جب ہندو مغلوب ہوتے تو ان کی حیثیت ذمی کی ہوجاتی اور انہیں سال میں مخصوص رقم سلطنت کو دینی پڑتی تھی۔ مگر یہ لوگ دولت سے اتنی محبت کرتے تھے

کہ وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے، مذہب کو بھی داؤ پر لگا دیتے۔ خوشی سے اپنی دولت کا کچھ حصہ ہرگز کسی کو دینا برداشت نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اپنی دولت کو بچانے کے لیے وہ اسلام قبول کر لیتے۔ پھر مسلمان ہونے کی صورت میں سلطنت کے اہم عہدے بھی حاصل کر لیتے تھے، جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر آرنلڈ لکھتے ہیں:

''اکثر ہندو دنیوی منافع کے خیال سے مسلمان ہونا گوارہ کیا، ہزار ہا راجپوت اسی طرح مسلمان ہو گئے، جن کی اولاد اب تک ملک کے دولت مند زمین داروں میں شمار ہوتی ہیں۔ ان میں بگجوٹی راجپوتوں کا مسلمان خاندان سب سے زیادہ معزز ہے جو ملک اودھ کے مسلمان تعلقہ دار کی فہرست میں اول درجہ رکھتا ہے۔ ایک روایت کے موافق اس خاندان کے وارث اعلیٰ تلوک چند کو بابر بادشاہ قید کر کے لے گیا اور تلوک چند نے قید سے رہائی پانے کے لیے اسلام قبول کیا۔'' (۶۱)

اس سے زیادہ وضاحت سے ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد نے اونچی ذات کے لوگوں کے قبول اسلام کی وجہ بتائی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''اپریل ۱۶۶۷ء میں سود خوری کے الزام میں چار ہندو قانون گویوں کو عہدہ سے معزول کیا گیا، سزا پانے کے ڈر سے ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ چوکی گڑھ کا انچارج بننے کے لیے بھوپ سنگھ نے اپنے بھائی مراری داس کو اسلام قبول کر لینے کی صلاح دی۔ لیکن اس نے اپنے بھائی کے لالچ بھرے مشورہ کو تسلیم نہیں کیا اور ہندو ہی رہا۔ ۱۶۸۱ء مین منوہر پور کے زمین دار دیوی چند نے اسلام قبول کیا تا کہ ۲۵۰ رفوجیوں کے بجائے ۴۰۰ رکا منصب حاصل کرے۔ چنانچہ ۱۵ جنوری ۱۷۰۴ء کو اس نے اسلام قبول کیا۔ راجہ اسلام خاں نے ہندو مذہب ترک کر کے اسلام قبول کیا تا کہ اپنے بہن کی شادی اورنگ زیب کے بیٹے سے کر سکے، لیکن یہ شادی نہیں ہو سکی۔ جاگیر حاصل کرنے کے لیے رام پور کے شاہی منصب دار راؤ گوپال سنگھ کے بیٹے رتن سنگھ نے اسلام قبول کیا۔'' (۶۲)

معلوم یہ ہوا کہ ہندوؤں کے نزدیک اپنے دھرم کی کوئی حقیقت نہیں تھی اس لیے وہ اپنی دولت کی حفاظت کے لیے اپنے دھرم کو بھی خیر باد کہہ دیتے تھے۔ حالاں کہ مسلمان فاتحین نے انہیں اپنے مذہب پر قائم رہنے اور ان پر عمل کرنے کی پوری آزادی دے رکھی تھی کہ وہ جزیہ

ادا کر کے من مانی زندگی اختیار کریں۔مگر ہندو اپنے مذہب کو بچانے اور اس پر قائم رہنے کی خاطر اپنی دولت کا معمولی حصہ ادا کرنے سے پیچھے رہے۔ یہ ان کے مذہب کی کمزوری تھی، یا اسلام کا قانون اس کے لیے مزاحم بنا۔سچا مذہب وہی ہے جو اپنے ماننے والوں کے ایمان ویقین کو اس طرح مستحکم کردے کہ وہ سب کچھ تو کر سکتے ہیں مگر اپنے ایمان کا سودا ہرگز نہیں کر سکتے۔آج دنیا میں بڑی بڑی جنگیں ہورہی ہیں اور لوگ اسلام کو مٹانے کی ہر ممکن کوشش کررہے ہیں مگر اسلام کے شیدائی اپنے مذہب کو زندہ رکھنے کے لیے دشمنان دین کا کھل کر بلکہ آگے بڑھ کر مقابلہ کررہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

ہندوستان میں اشاعت اسلام کے اسباب وعوامل:

ہندوستان میں اسلام کی آمد کے وقت یہاں کے دو قدیم مذہب ہندومت اور بدھ مت کے درمیان کش مکش جاری تھی۔جس میں بدھ ازم کو دوبارہ عروج حاصل ہورہا تھا۔ان مذاہب کے رہنما سماجی تفریق کے ناسور کا مداوا پیش کرنے سے قاصر رہے۔اگر اس طرح کی برائے نام کوئی کوشش کی بھی تو اس میں انہیں کوئی کامیابی نہ مل سکی۔اس کش مکش کا اور سماجی تفریق کا عوام بالخصوص سماج کے پچھڑے طبقہ پر کافی اثر پڑا۔اسی درمیان اسلام اپنی صاف ستھری تعلیمات لے کر ان کے سامنے کھڑا ہوا،تو عوام کو نظر آیا کہ طمانینت قلب کے ساتھ ساتھ اسلام نے جو نظریہ حیات پیش کیا ہے اس میں بلاتفریق رنگ ونسل سب برابر ہیں اور انہیں اپنے اندر جگہ دینے کے لیے اسلام تیار ہے،لہٰذا ان لوگوں نے ایک نظر اپنے ماضی پر ڈالی اور الوداع کہتے ہوئے اپنے مذہب کو چھوڑ کر اسلام کی آغوش میں آتے چلے گئے اور مستقبل کو دینی ودنیوی اعتبار سے سنوارنے میں لگ گئے۔اب کوئی اونچی ذات کا ہندو کسی نائر سے چھو جانے اور غسل کیے بغیر کچھ کھا پی لینے کے جرم میں غریب الوطنی،قید اور غلامی کی صعوبتیں اٹھانے کے لیے مجبور نہ تھا۔یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اسلام کی اشاعت میں صرف صوفیاء اور عرب تجار کا صرف حصہ ہے۔بلکہ اس کامیابی کے پیچھے مندرجہ ذیل اسباب عوامل کارفرما تھے:

۱۔ عرب تجار کی تبلیغی مساعی۔

۲۔ سلاطین کا پے درپے ہندوستان پر حملہ کرنا اور مسلمانوں کا آباد ہونا ان سلاطین کے زیر اثر جنہوں نے نو وارد مسلمانوں کو اپنے سماج میں بلافرق وامتیاز جذب کیا۔

۳۔ علماء کی تدریسی، تقریری اور تحریری خدمات۔

۴۔ صوفیاء کرام کی جدوجہد۔

۵۔ انسانی مساوات و بشر دوستی کا اسلامی عقیدہ۔

۶۔ ذات پات کی تفریق سے نفرت و بیزاری۔

ان میں سے ہر عامل نے اپنے اپنے خطوط پر نمایاں کردار ادا کیا۔ اگر ان میں سے کسی ایک کو اشاعت اسلام کی بحث سے خارج کر دیا جائے تو کئی اہم سوالات پیدا ہو جائیں گے۔ لہذا یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی کہ اسلام کی اشاعت تلوار کے ذریعہ ممکن ہی نہ تھی۔ بلکہ ان سب عوامل واسباب نے مل کر ہندوستانی سماج کو متاثر کیا اور جس کے نتیجے میں اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا۔ چوں کہ مذکورہ اسباب ومحرکات کے امین وعامل مسلمان ہی تھے اس لیے انہیں ابتدائی مزاحمت کے بعد جلد ہی اپنے مشن میں کامیابی مل گئی۔ (باقی آئندہ)

ماخذ ومراجع

(۱) سید ابوالاعلیٰ مودودی الجہاد فی الاسلام، ص:۲، مکتبہ معارف اعظم گڑھ

(۲) سہ روزہ دعوت دہلی، ۲۸ رجولائی ۲۰۰۳ء، ص:۴۰، خصوصی شمارہ: اسلام اور غلط فہمیاں، مضمون: اسلامی احکامات پر اعتراضات اور ان کی حقیقت، مضمون نگار: نثار اللہ

(۳) ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی، حقائق اسلام: بعض اعتراضات کا جائزہ، ص:۱۱، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۲۰۰۴ء

(۴) ایضاً، ص:۱۱-۱۲

(۵) ابوظفر ندوی، مختصر تاریخ ہند، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۷۹ء

(۶) The History of India as told by its own Historians. H.M. Eliot Ed. by John Dowsan (Introduction) pp. 22-23 Vol.1. kitab Mahal Allahabad

(۷) سید صباح الدین عبدالرحمٰن، اسلام اور مستشرقین (مجموعہ مقالات سمینار) ص:۵، ج:۲، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۸۶ء

(۸) سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مقالات سلیمان، ص:۳۹۰، ج:۱، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء

(۹) سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ، جولائی-ستمبر ۱۹۸۵ء، ص:۲۲-۳۳، برصغیر میں اسلام کی توسیع واشاعت میں صوفیائے کرام کا حصہ، مضمون نگار: پروفیسر اشتیاق احمد ظلی

(۱۰) جیمس فرگیسن، اسلامی فن تعمیر ہندوستان میں، ص:۱، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، ۱۹۳۲ء

(۱۱) مولانا احمد، مسلم حکومتوں کی رواداری، ص:۱۸، ادارہ تاج المعارف، دیوبند

(۱۲) ایضا

(۱۳) بسمبر ناتھ پانڈے، اسلام اور ہندوستانی ثقافت، ص:۲۹-۳۰، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۸ء

(۱۴) محمد اسد، اسلام دوراہے پر، ص:۴۶-۴۷، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۶۸ء

(۱۵) سالانہ مجلّہ، الدین،۲۰۰۶-۲۰۰۵ء ،ص :۸۲-۸۳،تھیالوجیکل سوسائٹی،شعبہ سنی دینیات،اے۔ایم۔یو،علی گڑھ، مضمون:اسلام،مستشرقین اور مدارس دینیہ،مضمون نگار:ڈاکٹر روقیر عالم فلاحی
(۱۶) سید صباح الدین عبدالرحمٰن،مقالات سلیمانی،ص:۳۸۴،ج:۱،مطبع معارف،اعظم گڑھ،۱۹۶۶ء
(۱۷) ایضاً،ص:۳۸۴-۳۸۵،ج:۱
(۱۸) سالانہ مجلّہ، الدین،۲۰۰۶-۲۰۰۵ء ،ص : ۸۵،تھیالوجیکل سوسائٹی،شعبہ سنی دینیات،اے۔ایم۔یو،علی گڑھ، مضمون:اسلام،مستشرقین اور مدارس دینیہ،مضمون نگار:ڈاکٹر روقیر عالم فلاحی
(۱۹) سید سلیمان ندوی،مقالات شبلی،ص:۱۳۳،ج:۴،مطبع معارف،اعظم گڑھ،۱۹۷۵ء
(۲۰) ایضا،ص:۱۳۳،ج:۴
(۲۱) سید صباح الدین عبدالرحمٰن،اسلام اور مستشرقین،ص۶۳:۲۲،ج:۲،مطبع معارف،اعظم گڑھ،۱۹۸۶ء
(۲۲) ایضا،ص:۲۲
(۲۳) ایضاً
(۲۴) History of Aurangzib, Sir Jadunath Sarkar pp. 163-190, Vol.3 OrientLimited, N.Delhi,1972
(۲۵) بسمبر ناتھ پانڈے،اورنگ زیب ایک نیاز اویہ نظر،ص:۴ دیباچہ،خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری،پٹنہ
(۲۶) ایضاً
(۲۷) History of Aurangzib, P:474, Vol:5 بحوالہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، بزم تیموریہ،ص:۲۲۲،ج:۱،مطبع معارف اعظم گڑھ،۱۹۹۰ء
(۲۸) History of Aurangzib, P:253, Vol:3 بحوالہ بزم تیموریہ،ص:۲۲۲،ج:۱
(۲۹) مغل ایڈمنسٹریسن،ص:۱۲۹-۱۳۰،بحوالہ:بسمبر ناتھ پانڈے،اسلام اور ہندوستانی ثقافت،ص:۲۰(مترجم اردو:تقی رحیم، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری،پٹنہ،۱۹۹۸ء
(۳۰) ہسٹری آف انڈیا،ص:۸۳،ج:۳،بحوالہ اسلام اور ہندوستانی ثقافت،ص:۳
(۳۱) ہندوستان کی مختصر تاریخ (الفسٹن)،بحوالہ بسمبر ناتھ پانڈے، ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایت،ص:۱۲، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری،پٹنہ
(۳۲) میڈول انڈیا(ایشوری پرشاد)ص:۱۱۰-۱۱۱،بحوالہ اسلام اور ہندوسانی ثقافت،ص:۱۱-۱۲۔سید صباح الدین عبدالرحمٰن،ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری،ص:۲۹،ج:۱،مطبع معارف،اعظم گڑھ،۱۹۷۵
(۳۳) سعید احمد اکبرآبادی،نفسۃ المصدوراور ہندوستان کی شرعی حیثیت،ص:۵۷،مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ،۱۹۶۸
(۳۴) اسلام اور ہندوستانی ثقافت،ص:۲۳-۴۵
(۳۵) تاریخ ہند عہد وسطی میں (مجموعہ مقالات)ص:۲۰۷-۲۷۹،خدابخش اورینٹل پبلک لائبری،پٹنہ،۱۹۹۹ء
(۳۶) سید صباح الدین عبدالرحمٰن،بابری مسجد،ص:۴-۶،مطبع معادف،اعظم گڑھ،۱۹۹۰ء
علامہ یوسف القرضاوی،اسلام مسلمان اور غیر مسلم،ص:۴۸-۴۹،یونیورسل بک فاؤنڈیشن،نئی دہلی،۱۹۹۲ء
(۳۷) ایشورٹوپا،ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول،ص:۸۹،انجمن ترقی اردو ہند،علی گڑھ،۱۹۶۲ء
(۳۸) خلیق احمد نظامی،سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات،ص:۴۴۹ ندوۃ المصنّفین،دہلی،۱۹۵۸ء
(۳۹) ایضا،ص:۴۴۹
(۴۰) ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایات،ص:۱۳

(۴۱) سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات،ص:۴۵۲-۴۵۳
(۴۲) امام ابو یوسف، کتاب الخراج،ص:۸۸،مطبع سلفیہ قاہرہ،۱۳۵۲ھ
(۴۳) شیخ محمد اکرام، رود کوثر،ص:۳۲۱-۳۲۴،ادبی دنیا مٹیا محل، دہلی،۱۹۹۸ء
(۴۴) ہندوستان میں قومی یکجہتی کی روایات،ص:۵
(۴۵) علاء الدین ابی بکر بن مسعود الکاشانی، بدائع الصنائع،ص:۱۱۱ج:۷مطبوعہ مصر،۱۹۱۰ء
مفتی محمد ظفیر الدین، اسلام کا نظام امن،ص:۱۴۷-۱۴۸،شعبہ تصنیف وتالیف، مفتاح العلوم، مئو،۱۹۶۶ء
قاضی ثناء اللہ پانی پتی، تفسیر مظہری،ص:۳۳۵-۳۵۴،ج:۵ندوۃ المصنفین، دہلی،
ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن،ص:۳۸۸-۳۹۷،ج:۳،ساہتیہ اکیڈمی، دہلی
(۴۶) کتاب الخراج،ص:۳۶
(۴۷) بدائع الصنائع،ص:۱۱۳،ج:۷
(۴۸) کتاب الخراج،ص:۸۸
(۴۹) بدائع الصنائع،ص:۱۱۳،ج:۷
(۵۰) ابوالاعلی مودودی، اسلامی حکومتوں میں غیر مسلموں کے حقوق،ص:۱۷،مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی،۱۹۹۸ء
(۵۱) محمد فرید وجدی، المدنیۃ والاسلام،ص:۱۵۰،مطبوعہ علی گڑھ،۱۳۲۲ھ
(۵۲) سہ ماہی تحقیقات اسلامی، علی گڑھ، جولائی-ستمبر۱۹۹۳ء،ص:۳۸،مضمون ہندوؤں کے ساتھ سلطان تغلق کا برتاؤ
مضمون نگار: ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی
ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، اسلامی قوانین کی ترویج وتنفیذ: عہد فیروز شاہی میں،ص:۳۷،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
(۵۳) اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر،ص:۴۰-۴۱
(۵۴) مقالات شبلی،ص:۲۳۱،ج:۱
(۵۵) ابوالکلام آزاد، جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد،ص:۸۴-مکتبہ ماحول، کراچی،۱۹۶۴ء
(۵۶) سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر،ص:۴۶،مطبع معادف، اعظم گڑھ،۱۹۶۴ء
(۵۷) مقالات شبلی،ص:۲۲۲،ج:۱
(۵۸) ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، جنوری۱۹۲۰ء،ص:۴۶-۴۷،مضمون: محمد تغلق کا دور حکومت
(۵۹) جامع الحکایات ولامع الروایات،ص:۴۷،بحوالہ مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری،ص:۴۷
(۶۰) اے شارٹ ہسٹری،ص:۲۱۸-۲۱۹ ترجمہ اردو: مختصر تاریخ ہند، یوسف کوکن عمری،ص:۲۱۸-۲۱۹
(۶۱) ٹی-ڈبلو-آرنلڈ-دعوت اسلام (آرنلڈ) ص:۲۷۷،مطبع فیض عام، آگرہ،۱۸۹۸ء
(۶۲) اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر،ص:۴۳-۴۴

❁ ❁ ❁

یارِ غار، لمحاتِ زندگی

از: محبوب فروغ احمد قاسمی
استاذ حدیث مدرسہ حسینیہ کایم کلم کیرالا

اس فقید المثال شخصیت کی زندگی کو- جو اس آب وگل میں رسول اللہ ﷺ سے صرف دو ڈھائی سال بعد آنکھیں کھولتی ہے، بچپن سے ہی یارانہ ہوجاتا ہے، فطرت کی سلامتی، وراستبازی کی وجہ سے تجارتی اسفار میں ساتھ رہتا ہے، اور جب نوزائیدہ اسلامی مملکت کی داغ بیل پڑتی ہے کہ وزیر معتمد، ومشیر خاص ثابت ہوتے ہیں- علامہ اقبال نے اس طرح سمیٹ کر رکھ دیا ہے

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

(بانگ درا)

اول مسلمان:

جب کہ آپ کی عمر ۳۸ سال تھی، اسلام کا آفتاب طلوع ہوا، حضرت ابوبکر بغرض تجارت یمن کے سفر پر تھے، لوٹے ہی تھے کہ مکہ کا پورا گروہ: احباب، ابوجہل، عتبہ، شیبہ وغیرہ، آپ کے گرد گھیرا ڈال دیا، اور نوزائیدہ دین اسلام کی اطلاع دی۔ نیز فراست ابوبکری، وتجربہ صدیقی سے فائدہ اٹھانا چاہا کہ عبداللہ کے یتیم بیٹے محمد نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ اللہ کے پیغمبر ہیں، اور ان پر حضرت جبرئیل وحی لے کر آتے ہیں، اس لیے لوگ بے چینی سے آپ کا انتظار کررہے ہیں، اس فتنے کی روک تھام میں تمہاری اصابت رائے کی ضرورت ہے، اور اگر یہ فتنہ بعجلت تمام دبایا نہ گیا، تو آبائی اقدار کا تسلط ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گا۔

ادھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، رسول اللہ ﷺ کے دوست، تجارتی سفروں کے رفیق، اور آپ کی پاکیزہ سیرت واخلاق کے عینی شاہد تھے، اپنی دوراندیشی، ومعاملہ فہمی اور اصابت رائے کی قوت سے حقیقت تک پہنچ گئے، احباب سے فرصت پاکر درِ رسالت پر پہنچے، وحی ونبوت سے متعلق

آپ کی زبان سے سنا، اور حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔(۱)

بعض روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ نبوت ملنے کے بعد حضور ﷺ آپ کے گھر تشریف لے گئے، اور اسلام کی پیش کش کی، حضرت ابوبکر نے بلا چوں و چرا مان لیا، اسی لیے حضور اکرم علیہ الصلاۃ والسلام کہا کرتے کہ: جس پر بھی اسلام پیش کیا، کچھ نہ کچھ تردد کا اظہار ضرور پایا، سوائے ابوبکر کہ اس نے بلا چوں و چرا قبول کرلیا۔(۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جب پوچھا گیا تو انھوں نے حضرت حسان بن ثابت کے اس قصیدے کا حوالہ دیا، جس میں حضرت حسان نے حضرت ابوبکر کی شان میں کہا ہے:

إذا تذكّرت شَجُـوًا من أخي ثقـة فاذكـر أخاك أبا بكر بما فعلا

والتالي الثاني المحمـود فشهـدهٗ وأول النّاس طرّاً صدق الرسلا

والثانى اثنين في الغار المنيف وقد، طاف العدو به إذ صعّد الجبلا(۳)

جب آپ کو کسی معتمد بھائی کی تکلیف یاد کرنی ہو تو حضرت ابوبکر کے کردار کو یاد کر لیجیے، جو رسول اللہ ﷺ سے متصل ہیں، دوسرے ہیں، جن کی مشکلات میں موجودگی کی تعریف کی گئی ہے، تمام لوگوں میں سب سے اول انسان ہیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کی ہے، غار حرا میں دو میں کے دوسرے ہیں، اور جب پہاڑ پر چڑھائے تو دشمن نے ان کے اردگرد چکر لگایا۔

صدیق وعتیق:

اس فرد آہن میں کبھی جنبش نہیں آئی، ابتداء سے انتہاء تک ایسی ثبات قدمی کا مظاہرہ کیا کہ کبھی تو صدیقیت کے خطاب سے نوازا گیا، تو کبھی عتیق من النار کا اعزاز بخشا گیا۔

اس سلسلے میں گرچہ آراء مختلف رہی ہیں کہ آیا عتیق وصدیق کا خطاب، آپ کے نام کا جزء کب بنا، لیکن صحیح بات تو یہی ہے کہ، یہ اسلامی دور کا اعزاز ہے، جس سے آپ نوازے گئے، ذیل میں ہم ایسی روایتیں ذکر کرتے ہیں جن سے ہمارے دعوے کو تقویت ملتی ہے۔

امام ترمذی نے حضرت عائشہ سے ایک روایت نقل کی ہے، جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک روز حضرت ابوبکر، حضور ﷺ کے پاس تشریف لائے، تو حضور نے فرمایا: أنت عتيق الله من النار فيومئذ سُمي عتيقاً کہ تم اللہ کی جانب سے جہنم کی آگ سے آزاد ہو، چنانچہ اسی دن سے ان کا نام عتیق پڑ گیا۔(۴)

بزار اور طبرانی نے یہی روایت نقل کی ہے، اور اس میں حضرت عائشہ کے بجائے حضرت عبداللہ بن زبیر ہیں اور آخر میں اتنا اضافہ اور ہے: وكان قبل ذلك اسمه عبد الله بن عثمان، کہ اس سے پہلے وہ عبداللہ بن عثمان کے نام سے جانے جاتے تھے۔(۵)

اسی طرح واقعہ معراج کی جب اطلاع، قریش مکہ کو ہوئی تو فاتحانہ انداز میں مذاق اڑایا، اور سمجھا کہ محمد کو جھٹلانے کا یہ موقع خوب ہاتھ آیا، دوڑے ہوئے حضرت ابوبکر کے پاس پہنچے، اور کہنے لگے: دیکھو! اب تمہارے دوست محمد (ﷺ) نے نیا شوشہ چھوڑا ہے، کہتا ہے کہ راتوں رات بیت المقدس گیا، پھر وہاں سے آسمانی دنیا کا سیر کیا، رب سے مناجات ہوئی، اور پھر واپس بھی آ گیا۔

حضرت ابوبکر نے صرف اتنا معلوم کیا کہ کیا واقعی انھوں نے یہی بات کہی ہے تو سب نے بیک زبان تصدیق کی تو حضرت ابوبکر نے کہا کہ اگر وہ کہتے ہیں تو بالکل سچ کہتے ہیں جب رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ کو صدیق کا لقب دیا۔(۶)

طبرانی کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قسم کھا کر کہا کرتے تھے کہ ابوبکر کا نام صدیق، آسمان سے اترا ہے۔(۷)

ایں شہادت گہے الفت میں قدم رکھنا تھا

قبیلۂ تیم جس سے آپ کا نسبی تعلق تھا، قریش میں کچھ زیادہ اہمیت کا حامل نہیں تھا، اس پر مستزاد یہ کہ ابھی تک یہ قبیلہ اسلام کی حلاوت سے آشنا نہ تھا، کہ وقت پر کچھ کام آ سکے، نیز آپ کی جسمانی ساخت بھی حضرت عمر و حمزہ رضی اللہ عنہما کی طرح مضبوط نہیں تھی کہ بچاؤ کیا جا سکے، لیکن ان سب کے باوجود، نئے دین کے دوررس تقاضوں کو صدیق کی ذات انگیز کیوں کر کر سکتی تھی، لہٰذا نہ دل میں مکہ کے سرداروں کا خوف آنے دیا جو سارے عرب میں محض اس لیے باعزت سمجھے جاتے تھے کہ بیت اللہ کے پیروہت اور متولی ہیں، اور نہ ان کے دشمنانہ رویوں اور نہ مخالفانہ طرز سے آپ کے پائے مبارک میں لغزش آئی، بلکہ اپنی زندگی کا اصل مشن ہی تبلیغ اسلام کو بنالیا، اور نئے دین کی اشاعت میں کسی قسم کا رخنہ آنے نہیں دیا، خواہ اس سلسلے میں انہیں کتنا کچھ بھی ستایا جاتا، لیکن آپ تھے کہ اسلام کی تبلیغ کیے جا رہے تھے۔

ایک مرتبہ حضور ﷺ بیت اللہ میں نماز پڑھ رہے تھے، اتنے میں عقبہ بن ابی مُعَیط آ گیا، اور آپ ﷺ کی گردن مبارک میں چادر کا گھیرا ڈال کر بل دینے لگا، حضرت ابوبکر کو جب معلوم ہوا تو

دوڑے آئے، عقبہ کو پکڑ کر دھکا دیا، اور کہا کہ اے لوگو! کیا تم اس شخص کو اس لیے قتل کرنا چاہتے ہو کہ یہ کہا ہے کہ اللہ ایک ہے۔(۸)

ایک اور موقع پر حضرت ابوبکر نے صحن حرم میں جہاں قریش کا مجمع تھا، علانیہ تبلیغ شروع کی، کافروں نے حضرت ابوبکر کو پکڑ لیا، اور بے تحاشا مارنا شروع کیا، عقبہ بن ربیعہ نے چہرے پر جوتے اتنے مارے کہ پہچانا نہیں جاتا تھا، جب قبیلہ تیم کو معلوم ہوا تو آکر چھڑایا، گھر لے گئے، لیکن حالت نازک ہوگئی جس پر قبیلہ کے لوگوں نے عتبہ کو دھمکی بھی دی، شام تک بے ہوشی ہورہی، جب ہوش آیا تو سب سے پہلے حضور کی خیریت معلوم کی، اور اس وقت تک چین نہیں آیا، جب تک کہ خود آکر حضور ﷺ سے دارارقم میں ملاقات نہ کرلی۔(۹)

کچھ سعید روحوں کا قبول اسلام

آپ کی کوششیں رائیگاں نہیں گئیں، بلکہ رفتہ رفتہ اسلام پھیلنے لگا، اور ایسے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے جو بعد میں چل کر، ستون اسلام ثابت ہوئے، ان سب میں آپ کی بے لوث تبلیغ کا اثر تھا، ان سعید روحوں میں جنھوں نے آپ کی وجہ سے اسلام قبول کیا، ان میں ممتاز حضرات یہ ہیں:

(۱) خلیفہ ثالث حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ (۲) حضرت عمر کے بعد چیف الیکشن حضرت عبدالرحمان بن عوف (۳) حضرت طلحہ بن عبیداللہ (۴) حضرت زبیر بن العوّام (۵) فاتح قادسیہ حضرت سعد بن ابی وقاص (۶) فاتح شام حضرت ابوعبیدہ بن الجراح۔(۱۰)

یہ سارے حضرات عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی شبانہ روز محنت کے نتیجے میں اسلام لائے، اسی لیے اپنے وغیر سب نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ حضرت ابوبکر وہ پہلے شخص ہیں جن کی وجہ سے اسلام کو ملکی معاشرے میں اہمیت وتقویت حاصل ہوئی، پھر حضرت حمزہ وحضرت عمر رضی اللہ عنہما کے اسلام کی وجہ سے استحکام ہوا، محمد حسین ہیکل لکھتے ہیں:

> وہ (مستشرقین) کہتے ہیں کہ جس ایمان کا مظاہرہ ابوبکر نے کیا، اور جس طرح انھوں نے رسول اللہ (ﷺ) کے ہر قول وفعل کی تصدیق کی، وہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اسلام یقیناً خدا کی طرف سے ہے، کیوں کہ باطل مذہب، اور ایک جھوٹا شخص کبھی اپنے ماننے والوں کے دلوں میں ایسا ایمان پیدا نہیں کرسکتا ہے(۱۱)

اسلام کی خاطر مالی قربانی

روایتوں میں آتا ہے کہ قبول اسلام کے وقت حضرت ابوبکر چالیس ہزار درہموں کے مالک تھے، لیکن ہجرت کے وقت صرف پانچ ہزار باقی رہ گئے تھے، انھیں انھوں نے راستہ کے خرچ کے لیے ساتھ رکھ لیا تھا، پورے پینتیس ہزار درہم ابوبکر نے اسلام کی راہ میں خرچ کیا۔ ان غلاموں و باندیوں کو آزاد کرایا جو پہلے سے ہی غلامیت کی وجہ سے نامساعد حالات سے دوچار تھے، قبول اسلام نے، ان کے کافر آقاؤں کو ظالم وجابر بنادیا، مگر یہ وہ نشہ تھا، جو اذیتوں کی ترشی کی وجہ سے اتر نہیں سکتا تھا، حضرت ابوبکر نے ان ظالموں کو منہ مانگی قیمتیں دے کر متعدد غلاموں اور باندیوں کو آزاد کرایا۔ (۱۲)

ان میں مشہور ومعروف: مؤذن رسول حضرت بلال حبشی، ان کی والدہ حمامہ، عامر بن فہیرہ، حضرت ابوفکیہ، حضرت زنیرہ، حضرت ام عبس، حضرت نہدیہ، اوران کی صاحبزادی، اور بنی مؤمل کی لونڈی لبینہ، یالبیبہ ہیں۔ (۱۳)

پھر آزاد کرنے کے بعد کبھی احسان نہ جتلایا، ایک موقع پر حضرت بلال سے اذان دینے کے لیے کہا تو حضرت بلال نے برجستہ کہا کہ اے ابوبکر کیا تم مجھے اپنی خلافت کے زعم میں حکم دے رہے ہو، یا پھر وہ احسان جتلا رہے ہو، جو تم نے خطیر رقم خرچ کر کے مجھے آزاد کرایا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان دونوں میں سے کچھ بھی نہیں تو حضرت بلال نے درخواست ٹھکرادی۔

ابوقحافہ جو حضرت ابوبکر کے والد تھے اور اب تک مسلمان نہ ہوئے تھے، کہا کرتے تھے کہ بیٹا! اگر ان کمزوروں کے بجائے، مضبوط جوانوں کو آزاد کرواتے تو وہ تمہارے لیے قوت بازو بنتے، اور تمہاری پشت پناہی کرتے، حضرت ابوبکر نے جواب دیا: ابا جان! میں تو وہ اجر چاہتا ہوں جو اللہ کے یہاں ہے۔ قرآن نے بالکل درست کہا ہے۔ (۱۴)

وسیجنبها الأتقی الذی یؤتی ماله یتزکی وما لأحد عنده من نعمة تجزی، إلا ابتغاء وجه ربه الأعلی ولسوف یرضی.

اوراس سے دور رکھا جائے گا وہ نہایت پرہیزگار جو پاکیزہ ہونے کی خاطر اپنا مال دیتا ہے، اس پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا اسے بدلہ دینا ہو، وہ تو اپنے رب

کی رضا جوئی کے لیے یہ کام کرتا ہے اور ضرور وہ اس سے خوش ہوگا۔

مجھے تمہاری امان کی ضرورت نہیں

قریش مکہ کے مظالم، صرف غلاموں، اور لونڈیوں تک محدود نہیں رہے بلکہ دست درازیاں، آزاد مرد وزن کو پریشان کررہی تھیں، آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر آنے والا وقت ایک نئی مصیبت کا پیغام ہوا کرتا تھا، اللہ پاک نے ایسے موقع پر ہجرت حبشہ کا اشارہ دیا، اور مسلمان ایک صلح جو، نرم طبیعت بادشاہ نجاشی کی پناہ میں منتقل ہونے لگے، اس دوران حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جو اپنے جرأت ایمانی اور پر استقلال عزم وحوصلہ سے لیس ہوکر خدمت اسلام میں منہمک تھے، لیکن طرح طرح کی مصیبتوں سے تنگ آکر ہجرت حبشہ کا عزم کرکے نکلے، ''بکر الغماد تک پہنچے تھے کہ ابن الدغنہ'' (جو کہ مکہ کا کافر اور بااثر ورسوخ باشندہ تھا) سے ملاقات ہوگئی، ابن الدغنہ، حضرت ابوبکر کی اصابت رائے، غم خواری خاص وعام سے واقف ہی نہیں متاثر تھا۔ پوچھنے لگا، ابوبکر! کہاں کا قصد ہے، حضرت ابوبکر نے ارشاد فرمایا کہ میری قوم نے مجھے تکلیفیں پہنچائیں، یہاں تک کہ میرا شہر میرے لیے تنگ کردیا۔ اب اس شہر کو چھوڑ کر جارہا ہوں۔ اس پر ابن الدغنہ اپنی امان میں لیا، اور کہا ابوبکر کا جیسا انسان اس شہر سے باہر نہیں جاسکتا، جو مہمانوں کی مہمان نوازی کرتا ہے۔ غریبوں کے ساتھ خیر خواہی، مفلسوں ونا داروں کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے، ابن الدغنہ ان کو واپس مکہ لایا۔ اور اپنی امان کا اعلان کردیا، لوگوں کی ملامت بھی کی۔

قوم اس بات پر راضی ہوئی کہ حضرت ابوبکر اپنے گھر میں ہی قرآن کی تلاوت کیا کریں گے، تاکہ قوم کے بچے اور عورتوں کو فتنہ میں مبتلا نہ کرسکیں۔

حضرت ابوبکر نے اپنے صحن ہی میں ایک جگہ تلاوت کے لیے مختص کرلی، لیکن آپ اس قدر رقیق القلب تھے کہ جب تلاوت فرماتے تو عورتیں اور بچے اپنی چھتوں پر چڑھ کر آپ کی تلاوت سنتے، جس سے وہ متاثر ہوتے جاتے تھے، قوم کو یہ کیوں کر گوارا ہوسکتا تھا، فوراً ابن الدغنہ سے اس کی شکایت کی، ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکر سے کہا کہ یا تو آپ میری امان میں رہیں یا تلاوت اس طرح نہ کریں، جس پر حضرت ابوبکر نے کہا کہ مجھے تمہاری امان کی ضرورت نہیں ہے، مجھے میرے اللہ کی امان کافی ہے، ابن الدغنہ نے بھی اس نقص امان کا اعلان قوم میں کردیا، پھر وہی ابتلاء و آزمائش شروع ہوگئی جو برسوں سے چلی آرہی تھی، بلکہ اس میں اور بھی تشدد پیدا ہوتا چلا گیا(۱۵)

سفر ہجرت میں یار غار کی رفاقت

سن دس ہجری میں بیک وقت دو دو محسن حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور ابوطالب کے اٹھ جانے سے رسول اللہ ﷺ کو جو غم ہونا تھا، وہ ہوا۔ اسی لیے یہ سال ''عام الحزن'' کے نام سے تاریخ کی کتابوں میں جانا جاتا ہے۔ پھر مزید طائف کے سفر میں جو ناروا سلوک، طائف والوں نے کیا، جس سے مکہ کے کفار اور بھی جری ہوگئے اور ہر طرح سے ستانے ہی نہیں بلکہ ختم کرنے (نعوذ باللہ) کی ناپاک کوشش سے بھی گریز نہ کیا، لیکن اللہ پاک نے اس کا انتظام پہلے سے ہی کر رکھا تھا۔ یثرب والوں نے اپنے یہاں آنے کی دعوت ہی نہیں دی بلکہ ہر طرح کی حفاظت کی ذمہ داری بھی لی، چنانچہ محرم ۱۳ نبوی سے ہجرت شروع ہوئی، اور دو مہینے میں دو سو خاندان کے قریب یثرب پہنچ گئے۔ صرف کمزور قسم کے لوگ ہی بچے تھے۔ یا پھر دربار رسالت، اور خاندان رسالت کے لوگ مصلحتاً بچ گئے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی اجازت طلب کی تھی، لیکن ان کو یہ کہہ کر روک دیا گیا تھا کہ: ہوسکتا ہے کوئی اچھا ساتھی مل جائے، حضرت ابوبکر نے اشارہ سمجھ لیا تھا۔ اسلیے اسی وقت سے تیاریاں شروع کردی تھیں۔ دو اچھی سی سواریاں بھی خرید لی تھیں، اور خوب کھلا پلا کر فربہ بھی کرلیا تھا، بالآخر صفر کے اواخر میں حضور اکرم ﷺ کو بھی ہجرت کا حکم مل گیا، ادھر حضور ﷺ کا معمول تھا کہ روز صبح وشام حضرت ابوبکر سے ملنے ان کے گھر تشریف لے جاتے، حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ ایک روز خلاف معمول، سر پر کپڑا ڈالے ہوئے دوپہر میں تشریف لائے، اور تخلیہ میں حضرت ابوبکر سے اپنے ارادے کا اظہار کیا کہ آج رات ہجرت کے لیے نکلنا ہے اور رفاقت تمہاری ہی رہے گی۔ حضرت ابوبکر تو اچھل پڑے، دوسری طرف دارالندوہ کے ابلیسی مشورے کی خبر رسول اللہ ﷺ کو اشارۂ غیبی سے ہوچکی تھی۔ اس لیے حضرت علی کو آج رات بستر پر سونے کا حکم دیا اور تہائی رات کے بعد کفار کے مجمع پر جو گھیرا ڈالے، دررسالت کے ارد گرد اس لیے بیٹھے تھے کہ صبح ہوتے ہی اجتماعی حملہ کرکے ہمیشہ کے لیے اسلام کا قصہ تمام کردیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ ان پر شاہت الوجوہ پڑھتے ہوئے اور ان کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے باہر نکل گئے، اور حضرت ابوبکر کے گھر پہنچے، حضرت ابوبکر سراپا انتظار بیٹھے تھے، جلدی میں سامان تیار کیا، توشہ دان باندھنے کے لیے کچھ نہ ملا تو حضرت اسماء نے اپنا پٹکا چاک کرکے باندھا (اس طرح وہ ہمیشہ کے لیے ذات النطاقین کے نام سے مشہور ہوگئیں) حضرت ابوبکر نے باقی ماندہ ۵ ہزار درہم لیے، عقبی کھڑکی سے دونوں رفیق نکلے، شہر سے تین

چار میل دور غار ثور میں ایک دو روز کے لیے چھپ گئے، اس دوران حضرت ابوبکر کے صاحبزادے حضرت عبداللہ، قریش کی تمام نقل وحرکت پہنچاتے رہے، جواں سال صاحبزادی حضرت اسماء تمام خطرات کو انگیز کر کے کھانا پہنچایا کرتی، اور غلام عامر بن فہیرہ بکریوں کو چرانے اسی طرح لے آتے ضرورت کے مطابق دودھ وگوشت پلاتے اور کھلاتے، اس طرح حضرت ابوبکر کا پورا گھرانہ ہجرت کے عمل میں شریک رہا اور جو نہ شریک رہا مثلاً عبدالرحمان بن ابی بکر (جو ابھی تک کفر کی گندگی میں ملوث تھے) انھوں نے بھی اس راز کو بالکل فاش نہ کیا۔

آنسو بہہ نکلے

یہ دو نفری قافلہ، غار ثور پر پہنچا، حضرت ابوبکر نے روایتوں کے مطابق آپ کو اپنے کندھے پر اٹھالیا تاکہ قدم مبارک کے نشان نہ آنے پائے مبادا قدم شناشی سے پکڑے جائیں۔ غار کے دہانے پر پہنچے، رسول اللہ ﷺ کو تھوڑی دیر کے لیے وہیں پر روک دیا، خود اندر تشریف لے گئے، غار کو خوب اچھی طرح صاف کیا، کچھ سوراخ تھے، جس سے زہریلے جانور سے خطرہ تھا، ان سبھوں کو اپنی چادر پھاڑ کر بند کیا، پھر حضور کو آواز دی، حضور اندر تشریف لے گئے۔ تین چار میل کا سفر وہ بھی پہاڑی سفر، بڑا دشوار گزار رہا۔ زانوئے صدیقی پر سر رکھ کر سو گئے۔ اتنے میں ایک سوراخ نظر آیا۔ حضرت ابوبکر نے اپنا انگوٹھا ہی اس پر رکھ دیا، ایک روایت کے مطابق کسی زہریلے سانپ نے آپ کو ڈس لیا، تکلیف کی شدت بڑھتی جارہی تھی، لیکن اس وقت، ماضی حال، مستقبل کی سب سے عظیم شخصیت آپ کے زانو پر سر رکھے ہوئی تھی، حرکت کرنے کی بھی زحمت نہ کی، لیکن شدت کی تاب نہ لاکر، آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور آپ کے رخ انور پر اس کے بعض حصے گرے، جس سے آپ کی آنکھ کھلی، حضرت ابوبکر کو آبدیدہ دیکھ کر وجہ دریافت کی۔ حضرت ابوبکر نے ساری تفصیلات بتائی، تو حضور ﷺ نے لعاب دہن اس ڈسے ہوئے مقام پر لگادیا، جس سے تکلیف جاتی رہی۔

کھسیانی بلی کھمبا نوچے

ادھر بدبختوں کی جماعت نے، جب صبح کی، اور حضور ﷺ کے بجائے، حضرت علی کو بستر رسالت سے بے دار ہوتے ہوئے دیکھا، تو دماغ ٹھکانے پر نہ رہا، جھلاہٹ کی حالت میں کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا جائے، کبھی تو حضرت علی سے سختی سے پوچھ رہے تھے، لیکن حضرت علی

کیوں کر کچھ بتا سکتے تھے، جب یہاں سے مایوسی ہوئی تو سیدھا حضرت ابوبکر کے گھر پہنچے، وہاں بھی گھر کو خالی دیکھ کر یقین ہوگیا کہ یہ دونوں نکل چکے ہیں، حضرت اسماء سے پوچھا، جس پر حضرت اسماء نے لاعلمی کا اظہار کیا، تو بدبخت وبدباطن ابوجہل نے ایک ایسا طمانچہ مارا جس سے کان زخمی ہوگیا اور بالی دور گری، مگر حضرت اسماء نے کچھ نہیں بتایا۔

جب ہر طرح سے مایوسی رہی تو کفار نے اعلان کردیا کہ جو زندہ یا مردہ پکڑ کر لائے گا اسے نقد سو اونٹ انعام دیا جائے گا۔

غارِ ثور اور تلاشی مہم

کفار کی جانب سے تلاشی مہم جاری رہی، جوں جوں وقت گزرتا جارہا تھا۔ انعام کا حریص اور بھی شدت اختیار کرتا گیا، ایسا لگتا تھا کہ وہ لوگ اسی کے لیے ادھار بیٹھے تھے، کھاڑیاں، جھاڑیاں، پہاڑیاں غرض کہ ہر جگہ چھان ماری، لیکن کہیں سراغ نہ لگا، ایک مرتبہ تو غارِ ثور کے منہ پر آگئے، قریب تھا کہ اگر وہ اندر کو جھانک لیتے تو یہ دونوں مقدس ہستیاں نظر آجاتیں، حضرت ابوبکر کو تشویش ہوئی اور تشویش ہونی ہی چاہیے، ان کو فکر اپنی جان کی نہیں بلکہ خلاصۂ کائنات کی تھی، انھوں نے اپنی تشویش کا اظہار چپکے سے، حضور سے بھی کیا، حضور نے فرمایا کہ اے ابوبکر: لاتحزن إن اللّٰہ معنا غم کی حاجت نہیں ہے، اللہ کی معیت ہمارے لیے ہے۔ یہ سننا تھا کہ حضرت ابوبکر پر گویا سکینت نازل ہوگئی۔ ایک بدبخت اندر گھسنے کا ارادہ بھی کررہا تھا، مگر بعض نشانیوں کو دیکھ کر خود بھی باز رہا، اوراوروں کو باز رکھا۔

قرآن پاک نے اسی واقعہ کو ''ثانی اثنین'' کے لفظ سے ذکر کیا ہے، اور اس طرح حضرت ابوبکر کو دو میں کا دوسرا کہہ کر جاودانی عظمت وشرف سے سرفراز کیا ہے۔ جسے آج کروڑوں کی تعداد میں مسلمان تلاوت کرتے ہیں، اور وہیں پر إن اللّٰہ معنا کا حوالہ بھی پڑھتے ہیں۔ غارِ ثور کے اسی واقعہ، اور رفاقت وجذبۂ جاں نثاری کو اردو وفارسی میں ''یارِ غار'' کے لقب سے جانا جاتا ہے، جس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ انتہائی جاں نثار، اور مشکل وقت میں کام آنے والا دوست۔

غارِ ثور سے روانگی

تین دنوں تک غارِ ثور میں قیام کرنے کے بعد، حضرت عبداللہ بن ابی بکر نے اطلاع دی کہ اب سب تھک ہار کر بیٹھ گئے ہیں۔ تب حضرت ابوبکر نے پہلے سے تیار کی ہوئی دونوں سواریاں

منگوائیں، ایک حضور کی خدمت میں پیش کی، اور ایک پر خود سوار ہوئے، ساتھ میں حضرت عبداللہ، وحضرت عامر بن فہیرہ کو لیا اور راستے کی رہنمائی کے لیے ایک کافر مگر قابل اعتماد شخص عبداللہ بن اریقط (ارقد) کو لیا اور مقدس ومختصر قافلہ مدینے کے لیے روانہ ہوا، راستہ بھر کی کیفیت عجیب رہی، جب بھی کسی خطرے کا احساس ہوا، جدھر سے ہوا ادھر ہی حضرت ابوبکر ہو جاتے ہیں کہ مبادا کوئی خطرہ لاحق ہو تو اس کا شکار اولاً ابوبکر ہوں، پورے ایک دن ورات سفر کرنے کے بعد یہ قافلہ ایک درخت کے سایے تلے رکا۔ حضرت ابوبکر نے اپنی چادر، اس درخت کے نیچے بچھائی تاکہ رسول اللہ ﷺ استراحت فرماویں، خود نگہبانی میں لگے رہے۔ قریب ہی کچھ بکریاں چر رہی تھیں، جا کر دودھ دوہا، پھر تیار کر کے حضور کے پاس لائے، تاکہ حضور نوش فرمالیں۔

آپ کے اس جذبہ جاں نثاری کو دیکھ، عبداللہ بن اریقط بھی متأثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اس طرح یہ قافلہ تمام تر خطرات سے گزرتے ہوئے، یکم ربیع الاول ۱۳ نبوی، ۱۲ ستمبر ۶۲۲ء کو مدینہ کے مضافاتی محلات میں پہنچا۔

خادم ومخدوم میں فرق

اہل یثرب کو پتا چل چکا تھا، اس لیے سراپا انتظار بن کر چشم براہ تھے، لیکن ان میں اکثریت ان حضرات کی تھی، جنھوں نے حضور پرنور ﷺ کو کبھی بھی نہ دیکھا تھا۔ حضرت ابوبکر نے اپنی چادر حضور کے سر مبارک پر دراز کر دی، تاکہ سایہ بھی ہو جائے، اور خادم ومخدوم میں فرق بھی ہو جائے۔ اس طرح حضرت ابوبکر کا پورا گھرانہ اس ہجرت میں شریک رہا، جو اسلام ومسلمانوں کے لیے ایک انقلاب آفریں اقدام تھا، جس سے مسلمانوں کی عظمت وتفوق پر مہر تصدیق ثبت ہوئی۔ (۱۶)

مدنی زندگی

مقام سُنح میں قیام

مدینہ پہنچ کر اولین ضرورت اس بات کی تھی کہ مہاجرین باشندگان مکہ، وانصار باشندگان یثرب کے مابین ارتباط کامل پیدا کی جائے، تاکہ ایک دوسرے میں ضم ہو کر، ایک صالح معاشرہ کی داغ بیل پڑ سکے، رسول اللہ ﷺ نے مواخات کے ذریعے اس رشتۂ باہمی کو استوار کیا، اور ایسا جذبہ باہم پیدا کیا کہ رہتی دنیا تک اس کی مثال نہیں مل سکتی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مواخات قبیلہ خزرج کے ایک سرکردہ مسلمان سے ہوئی جس کا نام خارجہ بن زید بن زہیر یا زید بن خارجہ علی اختلاف القولین ہے۔ حضرت ابوبکر کے یہ مواخاتی بھائی، مدینہ کی مضافاتی بستی مقام ''سُنح'' میں رہتے تھے، طبائع کی ہم رنگی اور دینی جذبے کا انجذاب اس طرح رنگ لایا کہ اس انصاری بھائی نے اپنی بیٹی کی شادی - جن کا نام یا تو حبیبہ تھا یا مُلیکہ - حضرت ابوبکر سے کردی (۱۷) جن سے حضرت ام کلثوم پیدا ہوئی، حضرت ابوبکر نے اپنی رہائش وہیں مقام ''سُنح'' میں بنالی تھی، جب مسجد نبوی کے اردگرد کے پلاٹ مخصوص صحابہ میں تقسیم ہوئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حصے میں بھی ایک پلاٹ آیا، جس میں حضرت نے مکان تعمیر کرواکر، مکہ کے اہل وعیال کو وہیں رکھا، لیکن خود حضرت کے وصال تک مقام ''سُنح'' میں مستقل قیام پذیر رہے، وصال نبوی کے بعد جب خلافت کی ذمہ داری آئی، اور مقام سنح میں رہ کر امور خلافت میں کوتاہی ہونے لگی تو پھر مدینہ مسجد نبوی والے مکان میں منتقل ہوگئے۔ البتہ ہفتہ میں جمعرات کو مقام ''سُنح'' جایا کرتے تھے۔

صالح معاشرہ کے قیام میں حضرت ابوبکر کا حصہ

مقام ''سُنح'' میں رہنے کے باوجود، حضور ﷺ کے ہم دم ساتھ رہے، اور حضور ﷺ کی توجہ جن اہم مسائل پر ہوتی ان میں برابر شریک رہے، بلکہ آپ ہی معتمد خاص اور وزیر خاص تھے، ترمذی کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے دو وزیر آسمان والوں میں سے ہیں اور وہ جبرئیل ومیکائیل ہیں۔ اور دو وزیر زمین والوں میں سے ہیں اور وہ ابوبکر وعمر ہیں۔ (۱۸)

یہی وجہ ہے کہ وہ تجارت جو ابوبکر مکہ میں کیا کرتے تھے، جس کی خاطر انھوں نے یمن وشام کا بھی سفر کیا تھا، مدینہ میں قدرے سکون پانے کے بعد شروع کردیا، لیکن کبھی باہر کا سفر نہ ہوسکا، اور جو تجارتی خوش حالی مکہ میں حاصل تھی، مدینہ میں بالکل نہ رہی، بلکہ معقول گزر بسر کے لیے کمالیا کرتے تھے، باقی اوقات صالح معاشرہ کے قیام واستحکام کے لیے حضور کے شانہ بشانہ رہتے، بلکہ ہمیشہ گوش برآواز رہتے کہ زبان نبوت سے کوئی حکم صادر ہو اور اس کی تعمیل میں لگ جایا جائے۔

قریش مکہ کی بوکھلاہٹ

قریش مکہ بھی پل پل کی خبر سے واقف تھے۔ آپ ﷺ کے بچ نکلنے پر غم وغصہ سے باولے

ہوتے جارہے تھے، اور جس روحانی، اخلاقی، ومعاشرتی نظام کے قیام سے خائف تھے۔ اب مدینہ کی سرزمین میں اس مبارک انقلاب کا آفتاب طلوع ہوچکا تھا، وہ دیکھ رہے تھے کہ مدینہ کے نئے وپرانے باشندے ایک دوسرے میں ایسا جذب ہوچکے ہیں کہ کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔ انصار مدینہ نے ایثار کا ایسا جذبہ پیش کیا ہے کہ اپنا آدھا آدھا سرمایہ تک پیش کرنے سے بھی دریغ نہیں۔ ان سب کے علاوہ ان کو سب سے زیادہ خطرہ شامی تجارت کو تھا، کیوں کہ ان کا یہ قافلہ مدینہ سے قریب ہی ہوکر گزرتا ہے، انہیں خطرہ تھا کہ اب مسلمان ان کے اس قافلہ کو روکیں گے، سامانوں کو لوٹیں گے۔ مردوں کو قیدی وغلام بنائیں گے، اسی بوکھلاہٹ میں وہ مسلسل دھمکیاں بھیجنے لگے کہ اے یہود مدینہ! اگر تم نے انہیں وہاں سے نہ نکالا، تو ہم ایک زبردست فوج لے کر آئیں گے، اور تم سب کو نیست ونابود کردیں گے۔ (۱۹)

قریش مکہ کی چڑھائی، اور حضرت ابوبکر کی جرأت ایمانی

قریش نے ان دھمکیوں کے ساتھ، واقعتاً تیاریاں بھی شروع کردی تھیں، اس کے لیے انھوں نے ایک فنڈ مخصوص کیا تھا، جس کے لیے انھوں نے ایک تجارتی قافلہ ابوسفیان کی سرکردگی میں روانہ کیا تھا، تاکہ اس کے تمام منافع کو اس فنڈ میں جمع کیا جاسکے، ابوسفیان کا یہ قافلہ بھی خوب منافع حاصل کرکے واپس آرہا تھا، جس کو روکنے کے لیے، مسلمانوں کی مٹھی بھر جماعت نکلی تھی، لیکن یہ قافلہ بچ نکلا، قریش کو اس کی خوش خبری مل بھی چکی تھی، لیکن وہ ایک ہزار فوجی دستوں کے ساتھ چلے آرہے تھے کہ مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجادیں، رسول اللہ ﷺ نے تین سو اوپر صحابہ کو لیے ہوئے، جس میں صرف دو گھوڑے، ستر شتر سوار تھے، ۲؍رمضان ۲ ہجری کو ان کے مقابلے کے لیے صف آرا ہوئے۔ ۱۷؍رمضان المبارک کو قدسیوں کا یہ قافلہ بدر کے مقام پر خیمہ زن ہوا، یہ نہتے ضرور تھے، مگر دل مضبوط ومطمئن رکھتے تھے۔ انہیں ساز وسامان سے زیادہ اپنے اللہ پر بھروسہ تھا، جو لڑا کر یا تو غازی بناتا ہے یا گردن کٹوا کر شہیدوں کی فہرست میں درج کرتا ہے۔ دونوں مقام عالی ہیں۔

صحابہ نے حضور کے لیے ایک ٹیلے پر عریش (سائبان) بنایا، اور اتفاق رائے سے حضرت ابوبکر کو حضور کا باڈی گارڈ مقرر کیا، کس قدر نازک موقع تھا، دشمنوں کی تعداد کیل کانٹے سے لیس تھی، ہر وقت حملے کا خطرہ ہی نہیں موت کا اندیشہ تھا، لیکن حضرت ابوبکر ہی غار ثور کے مشکل مقام پر

بھی دو میں کے دوسرے تھے۔ آج بدر کی پہلی لڑائی - جس نے کفر کی کمر توڑ کر رکھ دی، اور مسلمانوں کا رعب سارے عالم پر بٹھادیا- میں بھی دو میں کے دوسرے تھے۔

رسول اللہ ﷺ حملے سے پہلے والی رات میں سراپا عجز وانکسار بن کر ہاتھ پھیلائے دعائیں کررہے تھے کہ باری تعالیٰ! یہ مٹھی بھر جماعت اگر آج فوت ہوگئی تو پھر اس روئے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا، الٰہی اپنا وعدۂ مدد پورا فرمایئے۔

روایتوں میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے اس قدر الحاح وزاری کیا کہ کئی مرتبہ چادر مبارک بدن سے نیچے گرگئی، حضرت ابوبکر بار بار اس کو کندھے پر ڈالتے رہے۔ آخر میں حضرت ابوبکر نے کہا کہ: یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، اس قدر دعاء کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ سے جو فتح ونصرت کا وعدہ کیا ہے وہ پورا ہوکر رہے گا۔ (۲۰)

حضرت ابوبکر کی اس گزارش میں ایسی کیفیت تھی کہ حضور نے وہیں پر دعاء ختم کردی اگلے روز جب صف بندی ہوئی تو حضرت ابوبکر کو میمنہ کا سردار مقرر کیا۔

بیٹے پر تلوار چلانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں

جنگ شروع ہونے سے پہلے دستور کے مطابق، کفار کی جانب سے حضرت ابوبکر کے صاحبزادے، عبدالرحمان بن ابی بکر- جواب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، نکلے اور مبارزت طلب کی، حضرت ابوبکر آگے بڑھے لیکن حضور ﷺ نے اجازت نہیں دی، اور فرمایا کہ تلوار نیام میں رکھ لو۔

حضرت عبدالرحمٰن نے مسلمان ہونے کے بعد ایک دفعہ حضرت ابوبکر سے ذکر کیا کہ: ابا جان! غزوۂ بدر میں ایک مرتبہ آپ میری تلوار کی زد میں آگئے تھے، لیکن میں نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ حضرت ابوبکر نے کہا کہ بیٹے اگر تو میری تلوار کی زد میں آگیا ہوتا تو میں تیری گردن اڑائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

اسیران قریش کو رہا کردیا جائے ترجمان نبوت کی رائے

اللہ پاک نے غزوۂ بدر کے ذریعے اسلام کو وہ شوکت دی کہ پھر کفر جرأت کے ساتھ سر نہ ابھار سکا۔ اس غزوہ میں جس بے جگری سے صحابہ کی قلیل تعداد نے لڑائی لڑی تھی، کہ اسیران قریش جن کی تعداد ۷۰ تھی، خوفزدہ تھے، انھوں نے حضرت عمر بن الخطاب کو اپنے ماموں عاص بن وائل کو قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ حضرت ابوعبیدہ کو اپنے باپ پر تلوار چلاتے ہوئے اور حضرت ابوبکر کو

اپنے بیٹے کے مقابلے میں مبارزت کے لیے اترتے دیکھا تھا۔اس لیے انھیں یقین تھا کہ انھیں کیفر کردار تک پہنچا کر ہی دم لیا جائے گا،حضور ﷺ نے صحابہ کو جمع کیا اور مشورہ کیا کہ کیا جائے، حضرت عمر تو اس پر مصر رہے کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے،مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حلیم الطبع ذات تھی، جو کہہ رہے تھے کہ آخر یہ بھی تو ہمارے ہی بھائی ہیں۔ یارسول اللہ ان کو رہا کیا جائے، ہوسکتا ہے اللہ پاک اسلام کی توفیق دے،خود حضور ﷺ بھی انتقامی کارروائی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آخر حضرت ابوبکر ہی کے مشورے پر فیصلہ ہوا کہ جو پڑھنا لکھنا جانتے ہیں وہ دس ناخواندہ مسلمان کو تعلیم دے کر رہا ہوں،اور جو خود ناخواندہ ہیں وہ فدیہ دے کر رہائی حاصل کرے۔(۲۱)

غزوۂ احد وحنین میں جواں مردی

یہ دو غزوے وہ ہیں جن میں ظاہری طور پر مسلمانوں کو اپنی بعض غلطی یا عجلت پسندی کی وجہ سے ہزیمت وقتی ہوئی، بالآخر بدحواسی ایسی پھیلی کہ نہ اپنا خیال رہا اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ کا،لیکن ان دونوں غزووں میں ہم حضرت ابوبکر کو اس طرح پاتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات مقدس سے چمٹے ہوئے ہیں کہ مبادا کفار کی یلغار سے رسول خدا کو زک نہ پہنچے۔

غزوۂ احد کے موقع پر حضور ﷺ ایک گڑھے میں گر گئے،تو سب سے پہلے اس گڑھے تک پہنچنے والے حضرت ابوبکر ہی تھے۔ جب احد سے کفار چلے گئے اور مسلمان زخموں سے چور چور تھے،کسی میں اٹھنے کی تاب نہ تھی،لیکن کفار کے تعاقب میں جانا ضروری سمجھا گیا،تو حضرت ابوبکر وزبیر وغیرہ ستر صحابہ نے حمراء الاسد تک ان کا تعاقب کیا،جس تعاقب کی وجہ سے امیر کفار ابوسفیان کو پلٹنے کا خیال بھی آیا تھا،مگر پلٹ نہ سکا۔(۲۲)

اسی طرح غزوۂ حنین میں جب مسلمانوں کے قدم اولاً اکھڑ گئے تو جن حضرات نے ثبات قدمی اور انتہائی عزم وحوصلہ جواں کا ثبوت دیا ان میں حضرت ابوبکر کی ذات بھی تھی۔طبقات ابن سعد میں ہے وثبت معه يومئذ (يوم حنين) العباس بن عبدالمطلب، وعلى بن أبي طالب، والفضل بن عباس، وأبوسفيان بن الحارث بن عبدالمطلب، و ربيعة بن الحارث، وأبوبكر وعمر، وأسامة، وزيد في اناس من اهل بيته وأصحابه.(۲۳)

اور جب کفار حنین سے بھاگے،اور قلع طائف میں محصور ہوئے،تو ان کا تعاقب خود ﷺ نے کیا اس میں بھی حضرت ابوبکر،حضور کے ساتھ رہے۔(۲۴)

صلح حدیبیہ میں عروہ کو ٹکا سا جواب

جب صلح حدیبیہ (۶ھ) جس کو قرآن پاک میں فتح مبین کہا گیا ہے۔ جس میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو سفیر بنا کر حضور نے مکہ بھیجا تھا لیکن ان کو اہل مکہ نے روک لیا تھا، اور اس طرح ان کی شہادت کی خبر پھیل گئی۔ حضور ﷺ نے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر، موت پر بیعت لی تھی؛ جسے بیعت رضوان کہا جاتا ہے، اور قرآن نے ان تمام صحابہ کو جنھوں نے بیعت رضوان کیا، خوشنودی کی سرٹیفکیٹ دیا ہے، جب قریش کو یہ خبر پہنچی تو ان کے دماغ بھی ٹھکانے لگے، اور نامہ پیامی کرنے لگے، عروہ بن مسعود ثقفی جو ایک مدبر شخص تھے اور اب تک دامن اسلام سے وابستہ نہیں ہوئے تھے، کفار کی جانب سے شرائط صلح طے کرنے کے لیے آئے اور اپنی جنگی تیاریاں بڑھا چڑھا کر بیان کی تاکہ مسلمان دب کر صلح کریں، یا ان کا رعب مسلمانوں پر بیٹھ جائے۔ حضرت ابوبکر ساری بات بہت غور سے سن رہے تھے۔ ان سے برداشت نہ ہوسکا اور عروہ کو ٹکا سا جواب دیا "امصص بظر اللات" کہ لات بت کی شرمگاہ چاٹ، کیا تو سمجھتا ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی مدد چھوڑ دیں گے۔

عروہ نے پوچھا یہ کون ہے، حضور نے فرمایا کہ: ابوبکر، تو عروہ نے کہا کہ اگر ابوبکر کے احسانات مجھ پر نہ ہوتے تو میں اس کا جواب دیتا۔ (۲۵)

حضور کی رکاب تھام لو

صلح حدیبیہ جو بظاہر دب کر ہوئی، صحابہ ہرگز تیار نہ تھے، لیکن حضور ﷺ نے وحی الٰہی کی بنا پر یہ صلح کی تھی۔ حضرت عمر سے بھی نہ رہا گیا، آخر حضور سے سوال و جواب بھی کیا، جس کا زندگی بھر انہیں افسوس رہا۔ حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کے پاس بھی جا کر عدم اطمینان کا اظہار کیا، لیکن ابوبکر تو نبوت کے رمز شناس تھے مقام صدیقیت پر فائز تھے، اور حضور کے ہر قول و فعل پر آمنّا وصدّقنا کہنا اپنے لیے مایۂ افتخار سمجھتے تھے، انھوں نے حضرت عمر سے کہا کہ عمر! حضور کی رکاب تھام لو، آپ نے جو کچھ کیا ہے، وہ اللہ کے حکم سے کیا ہے، دین و مسلمانوں کے فائدے کے لیے کیا ہے۔ (۲۶)

انہی کا یہاں آنا مناسب تھا

فتح مکہ کے موقع پر جس میں ہزاروں قدسیوں کا قافلہ، مکہ میں فاتحانہ داخل ہو رہا تھا، حضور

ﷺ کے ساتھ ابوبکر بھی ایک حصے کے علم بردار تھے، عام معافی کا دن تھا، کفار مکہ حضور ﷺ اور مسلمانوں کے بے پایاں حسن سلوک کو دیکھ کر اسلام سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، چنانچہ مسلمان ہونے کا تانتا بندھ گیا۔ عثمان ابوقحافہ جو حضرت ابوبکر کے والد ہوتے تھے، ابھی تک مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے، بینائی بھی جاتی رہی تھی، حضرت ابوبکر ان کو پکڑے ہوئے دررسالت میں پہنچے اور کلمہ پڑھانے کی درخواست کی، تو حضور نے فرمایا کہ ابوبکر! ان کو آنے کی کیا ضرورت تھی مجھے خبر کردیتے، میں ہی ان کی خدمت میں حاضر ہوجاتا۔ اور وہیں کلمہ پڑھوادیتا، لیکن حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ نہیں، اے اللہ کے رسول! انہی کا یہاں آنا مناسب تھا۔ ابوقحافہ مسلمان ہوئے اور حضرت عمر کی خلافت تک باحیات رہے۔ (۲۷)

خدا اور رسول کا نام چھوڑ آیا ہوں

اس طرح اسلامی مملکت پھیلتی گئی، لیکن ۹ھ رجب میں، سرحد کے شمال کی جانب سے تشویش ناک خبریں موصول ہونے لگیں، کہ بازنطینی بادشاہ ہرقل، مسلمانوں پر حملہ آور ہونے والا ہے، ادھر شدید گرمی، بلکہ ہوکا عالم ہے۔ صحابہ بے سروسامانی کے عالم میں ہیں۔ ابھی تو مختلف جنگوں سے فارغ ہوئے ہیں، جس میں جسم کا انگ انگ ٹوٹ رہا ہے، ابھی سب سے زیادہ ضرورت تجارت ومعیشت کی بحالی کی تھی، لیکن اسی عالم میں ایک منادی مسجد نبوی سے اعلان کرتا ہے کہ: لوگو! دشمنوں کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے تیار ہوجاؤ، اور جو بھی نقد اثاثہ ہو جہادی فنڈ میں جمع کردو، لوگوں نے تمام ضرورتوں کو بالائے طاق رکھ کر، اپنی اپنی بساط کے مطابق مال واسباب جمع کرنے شروع کیے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فوج کے ایک ثلث کا پورا خرچ اپنے ذمے لیا، نیز ایک ہزار اونٹ ستر گھوڑے، اور ایک ہزار طلائی دینار نقد پیش کیے، حضرت عمر بن الخطاب کے پاس بھی اس موقع پر غیر معمولی اسباب تھے، سب کا نصف لاکر حضور کی خدمت میں پیش کردیا، اور اس طرح ایک گونہ اطمینان محسوس کیا کہ آج اپنے ساتھیوں سے سبقت لے جائیں گے، لیکن دوسرے ایک نحیف وکمزور صحابی دور سے اپنے سارے سامان لادے ہوئے آرہے ہیں، حضور دریافت فرماتے ہیں کہ اہل وعیال کے لیے کتنا چھوڑا ہے، انتہائی سادگی سے فرماتے ہیں کہ اللہ و رسول کا نام چھوڑ آیا ہوں۔ وہ صحابی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی تھے۔ (۲۸)

علامہ اقبال نے اسی واقعہ کو اپنی مؤثر نظم میں اس طرح پرویا ہے۔

اتنے میں وہ رفیق نبوت بھی آ گیا جس سے بنائے عشق ومحبت ہے استوار
لے آیا اپنے ساتھ وہ مرد وفا سرشت ہر چیز جس سے چشم جہاں میں ہو اعتبار
ملک یمین ودرہم ودینار ورخت وجنس اسپ قمر، سم و شتر وقاطر وحمار
بولے حضور چاہیے فکر عیال بھی کہنے لگا وہ عشق ومحبت کا راز دار
اے تجھ سے دیدۂ ومہ وانجم فروغ گیر اے تیری ذات باعث تکوین روزگار

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

پہلا امیر حج

۹ ہجری کو عام الوفود بھی کہا جاتا ہے، کیوں کہ اب اسلام کا غلغلہ ہو چکا ہے اور لوگوں کا ایک تانتا ہے، جو وفود کی شکل میں مدینہ آ رہے ہیں۔ پھر دین اسلام سے روشناس ہو کر حلقہ اسلام سے وابستہ ہو رہے ہیں۔ اسی سن میں حج فرض ہوا، تو حضور ﷺ نے امیر حج کے لیے ابوبکر کا انتخاب کیا اور تین سو صحابہ پر امیر حج بنا کر مکہ روانہ کیا۔ مسلمانوں نے آپ کی امارت میں آزادانہ طور پر مناسک حج ادا کیے۔ (۲۹)

آنکھوں سے اشک رواں

پھر آئندہ سال ۱۰ ہجری میں اعلان عام ہوا کہ رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس حج کے لیے تشریف لے جا رہے ہیں، اس لیے لوگوں کا ایک انبوہ بعض روایتوں کے مطابق ایک لاکھ سے زائد کا مجمع مکہ میں جمع ہوا (۳۰) رسول اللہ ﷺ کا یہ آخری حج تھا، اس لیے حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ حضور نے اس موقع پر کئی وقیع خطبے دیے، جن میں دین تمام اہم اصولوں کو کھول کھول کر بیان کیے، اسی موقع پر الیوم اَکْمَلْتُ لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الإسلام دیناً، نازل ہوئی حضور نے لوگوں کو اس آیت کی خوش خبری دی، سب لوگ خوش بھی ہوئے، لیکن بندۂ ابوبکر تھا، جو پھوٹ پھوٹ کر روئے جا رہا تھا، ساتھیوں کو تعجب بھی ہو رہا تھا کہ ابھی تو اشک رواں کا کوئی موقع نہیں، لیکن وہ تو صدیقیت کے مقام پر فائز تھا۔ سمجھ رہا تھا کہ دین کی تکمیل کے بعد اب رسول ﷺ کی اس دار فانی میں کیا ضرورت ہے۔ اب اللہ پاک اپنے پاس بلانے والا ہے۔

مرض وفات اور سترہ نماز کی امامت

جب دین کی تکمیل ہوگئی، تو نبی کا کام پورا ہو چکا ہے، کچھ اشارہ غیبی سے بھی اس طرف متنبہ کر دیا گیا، اس لیے آپ نے بھی ساری تیاریاں مکمل کر لی، ۱۸ یا ۱۹ صفر کو جنت البقیع تشریف لے گئے، مدفونین کے لیے دیر تک دعائے مغفرت کی، واپسی پر طبیعت ناساز ہوگئی، ابتدائی دنوں میں آپ ﷺ خود تشریف لاتے اور نماز پڑھاتے، لیکن جب نقاہت زیادہ ہوگئی، تو حضرت ابوبکر کو حکم دیا کہ وہ نماز پڑھائیں، ہر چند کہ حضرت ابوبکر رقیق القلب تھے ان سے رسول اللہ کی موجودگی میں کھڑا ہونا دشوار تھا۔ حضرت عائشہ وصفیہ رضی اللہ عنہا بھی مصر تھیں کہ حضرت عمر کو حکم دیا جائے، لیکن رسول اللہ ﷺ نے سختی سے حکم دیا کہ ابوبکر نماز پڑھائیں، اس طرح آپ کی زندگی میں ہی، رحلت سے قبل تک ۱۷ نمازوں کی امامت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کی۔ (۳۱)

سب دریچے بند کر دیے جائیں سوائے ایک دریچے کے

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مسجد نبوی کے اردگرد رہائشی پلاٹ سے حضرت ابوبکر کو بھی ایک حصہ ملا تھا، جس میں انھوں نے ایک مکان بنوایا تھا، اس کی ایک کھڑکی مسجد کی جانب کھلتی تھی۔ حضور ﷺ نے دوران مرض ایک روز افاقہ محسوس کیا تو مسجد تشریف لائے، اور منبر پر تشریف رکھ کر فرمانے لگے کہ اللہ پاک نے ایک بندے کو اختیار دیا کہ وہ چاہے تو دنیا کو اختیار کرے یا پھر آخرت کو ترجیح دے، چنانچہ اس بندۂ خدا نے آخرت کو ترجیح دیا۔ یہ سن کر مجمع میں سے حضرت ابوبکر کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو ابلنے لگے، حضور نے فرمایا کہ: ابوبکر! صبر سے کام لو، پھر فرمایا کہ: سب دریچے بند کر دیئے جائیں صرف ابوبکر کا دریچہ کھلا رہے گا، پھر حضرت ابوبکر کے احسانات حضور نے گنوائے۔ (۳۲)

عمر بیٹھ جاؤ

حضرت ابوبکر کے ذمے ایک تو نماز کی امامت کی ذمہ داری آئی، دوسرے حضور ﷺ کی علالت کی وجہ سے وہ اپنے گھر - جو مقام ''سُنح'' میں تھا - نہ جا سکے، ایک روز صبح کی نماز کے بعد حضور سے اجازت لے کر ''سُنح'' چلے گئے، اتنے میں حضور کا وصال ہوگیا۔ یہ خبر آگ کی طرح

پھیلی، حضرت ابوبکر دوڑے ہوئے تشریف لائے، مسجد نبوی پہنچے تو دیکھا کہ صحابہ بدحواس ہیں، حضرت عمر ننگی تلوار لیے کھڑے ہیں، اور اعلان کررہے ہیں کہ جو کوئی کہے گا کہ محمد کی وفات ہوگئی ہے، اس کی گردن تن سے اڑادوں گا۔ حضرت ابوبکر اولاً حجرۂ مبارکہ میں تشریف لے گئے، رخ انور سے چادر ہٹائی، پیشانی کو بوسہ دیا اور طِبْتَ حیًا میتًا کہتے ہوئے باہر تشریف لائے۔ حضرت عمر ابھی تک لوگوں کو دھمکا رہے تھے۔ حضرت ابوبکر نے کہا کہ: عمر! بیٹھ جاؤ، حضرت نہ بیٹھے، بڑا ہی نازک وقت تھا، کسی کے حواس ٹھکانے نہ تھے۔ حضرت ابوبکر کھڑے ہوئے اور تقریر شروع کی کہ: اے لوگو! تم میں سے جو لوگ محمد (ﷺ) کی عبادت کیا کرتا تھا، وہ سن لے کہ محمد وفات پاچکے ہیں، اور جو کوئی اللہ کی عبادت کیا کرتا تھا، تو اس کا معبود حی لایموت ہے۔ پھر آپ نے ما محمد إلا رسول قد خلت من قبله الرسل اخیر تک پڑھی، مجمع یکا یک چونک اٹھا، حضرت عمر میں سکت نہ رہی کہ کھڑے رہ سکیں، لڑکھڑا کر زمین پر گر گئے، اور اس طرح لوگوں کو یقین آ گیا کہ حضور کا وصال ہو چکا ہے۔ (۳۳)

یہ ہے یارِ غار کی زندگی کے لمحات، جس نے اسلام کے بعد سے لے کر، وفات نبوی تک کس جذبہ جانثاری و اولوالعزمی کا ثبوت پیش کیا۔ گویا کہ اپنی زندگی کی دھن ہی، رسول اللہ ﷺ سے وابستگی، وارفتگی کرلی تھی کہ لمحہ بھر کا فراق بھی کبھی گوارا نہ کرسکے۔

❁ ❁ ❁

حواشی:

(۱) البدایہ والنہایہ: ۳/۲۸۔
(۲) سیرت ابن اسحاق بحوالہ البدایہ والنہایہ: ۳/۲۷۔
(۳) دیوان حسان بن ثابت شرح یوسف عید، ط: ۱۴۱۲ بیروت، ص: ۲۸۲، قافیۃ اللام، قصیدہ خیر البریۃ۔
(۴) ترمذی: ۲/۲۰۸۔
(۵) مجمع الزوائد: ۹/۴۰۔
(۶) البدایہ والنہایہ: ۳/۱۱۳۔
(۷) مجمع الزوائد: ۹/۴۱۔
(۸) بخاری: ۱/۵۲۰۔
(۹) البدایہ والنہایہ: ۳/۳۰۔
(۱۰) تاریخ طبری: ۲/۴۷۶، البدایہ والنہایہ: ۳/۳۰۔

(۱۱) ابوبکر صدیق مترجم محمد احمد پانی پتی ص:۴۸ بحوالہ عشرہ مبشرہ اردو:۴۷۔
(۱۲) طبقات ابن سعد:۱۷۲/۳۔
(۱۳) البدایہ والنہایہ:۵۸/۳ سیرت محمد بن اسحاق اردو ترجمہ:۲۶۴۔
(۱۴) سیرت محمد بن اسحاق اردو:۲۶۴۔
(۱۵) البدایہ والنہایہ:۹۴/۳-۹۵۔
(۱۶) دیکھئے تفصیلات، البدایہ والنہایہ:۱۷۷/۳-۱۹۶، تاریخ طبری:۵۰۴/۲-۵۰۸۔
(۱۷) معجم البلدان:۳۰۱/۳۔
(۱۸) ترمذی:۲۰۹/۲۔
(۱۹) عشرہ مبشرہ:۶۵۔
(۲۰) بخاری شریف:۵۶۴/۲۔
(۲۱) البدایہ والنہایہ:۲۹۷/۳۔
(۲۲) بخاری شریف:۵۸۴/۲۔
(۲۳) طبقات ابن سعد:۱۵۱/۲۔
(۲۴) البدایہ والنہایہ:۳۵۰/۴۔
(۲۵) البدایہ والنہایہ:۱۶۶/۴، ۱۶۷۔
(۲۶) مسلم:۱۰۶/۲۔
(۲۷) سیرت حلبیہ اردو ترجمہ مولانا اسلم صاحب قاسمی استاذ حدیث دارالعلوم (وقف) دیوبند:۲۶۹/۳۔
(۲۸) ترمذی:۲۰۸/۲۔
(۲۹) بخاری:۶۲۶/۲۔
(۳۰) الاصابہ مقدمہ:۴۔
(۳۱) بخاری:۹۳/۱-۹۵۔
(۳۲) بخاری:۵۱۶/۱، ترمذی:۲۰۷/۲۔
(۳۳) بخاری:۵۱۸/۱، ۶۴۰/۲۔

❁ ❁ ❁

ذہانت، منزلِ حکمت کی جانب گامزن ہوجائے...!

از: عزیز بلگامی

''یقیناً...۱) آسمانوں اور کرّۂ ارض کی تخلیق میں اور... ۲) گردشِ لیل ونہار میں اور...۳) بحر (کی موجوں) میں (ڈولتی ہوئی محوِسفر) کشتی میں، جو کرّۂ ارض کے باشندوں کے لیے منفعت بخش ہے اور...۴) آسمان کی بلندیوں سے اللہ نے جس بارش کو نازل فرمایا، جس کے ذریعہ اُس نے زمین کو اس کے بے جان ہوجانے کے بعد (دوبارہ) زندگی دی اور...۵) زمین میں حرکت کرنے والے ہرنوع کے جانور پھیلا دیے اور...۶) ہواؤں کے (تیز گامی یا سست گامی کے ساتھ چلنے، رُخ) بدلنے میں اور...۷) آسمان اور زمین کے درمیان (بغیر کسی ستون کے معلق ہونے والے آب بردوش) بادلوں میں اور تابعِ فرمان (بن کر ضرورت مند انسانیت کے لیے پانی کا ایک زبردست منبع) بن جانے میں، (الغرض، مذکورہ بالا سات قسم کے عام تجربے کے اِن قدرتی مظاہر میں)...اُن باشندگانِ زمین کے لیے یقیناً نشانیاں (Signs اور Evidences) ہیں جو عقل رکھتے ہیں (منطق یا Logic یا Reasoning کی دولت سے مالا مال ہیں)۔''

قرآنِ حکیم کی دوسری سورۃ کی ایک سو چوسٹھویں آیت میں درج یہ سات بظاہر عام قسم کے مظاہرِ قدرت ہیں۔ لیکن اِن میں ایک باشعور، صاحبِ عقل ودانش کے لیے غور وفکر کا بھرپور سامان موجود ہے:

ہم جانتے ہیں کہ انسانی دماغ بے شمار صلاحیتوں اور قابلیتوں کا مرکز ہوتا ہے۔ اشرف المخلوقات میں شمار اِنسان کے دماغ کو اس کے خالق نے ایک انتہائی بیش قیمت نعمت سے سرفراز کیا ہے جسے عرفِ عام میں ذہانت یا Intellect کہتے ہیں۔ ہر انسان کو اچھائی اور برائی، نیکی اور بدی، سیاہ اور سفید، سچ اور جھوٹ، حق اور باطل، اندھیرے اور اُجالے میں تمیز کرنے کی فطری صلاحیت بخشی گئی جس کی کرنیں اِسی دماغ سے پھوٹتی ہیں۔ وہ انسان جو اپنی نظروں کے سامنے آراستہ منظر

کی ہر روشن شئے پر غور وفکر کرتے رہتے ہیں، جنہیں حالات کا تجزیہ کر کے اپنے لیے ایک لائحہ عمل یا line of Action متعین ومرتّب کرنے، اِسے ایک رخ دینے اور اپنی تیز گامی یا سست گامی کے مابین ایک اعتدال برقرار رکھنے کا سلیقہ ہوتا ہے۔ ایسے انسانوں کو صاحبِ شعور، ذہین، Sensible یا Intelligent انسان کہا جاتا ہے۔ ایک ذہین انسان میں سوچنے، سمجھنے، سیکھنے، حقائق تک پہنچنے اور حالات کا تجزیہ کر کے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ کسی بھی صورتحال کا پہلی مرتبہ کس طرح مقابلہ کیا جائے، ناخوشگوار یا خوشگوار حالات سے کیسے نمٹا جائے اور دوسری مرتبہ یہ پھر رونما ہوں تو کس طرح اِن سے نمٹنے کے طریقہ کار میں سدھار یا Improvement لایا جائے، کس طرح اپنے حواس خمسہ کے استعمال کے ذریعہ بہتر سے بہتر کی طرف بتدریج پیش قدمی کی جائے، عمر کے اضافے کے ساتھ ساتھ برتاؤ، رویوں، تال میل اور جذب وانجذاب میں کس طرح مثبت تبدیلی لائی جائے، یہ اور اس نوع کے مراحل ہر ذہین انسان کی زندگی میں رونما ہوتے ہیں، جن کے درمیان سے وہ گزرتا ہی رہتا ہے۔ اِس میں کارفرما قوّتِ نافذہ دراصل اپنے لیے ایک بہتر مستقبل کی جستجو اور فکرمندی ہی ہوتی ہے۔ عام طور سے ذہانت اور حکمت یا (Wisdom & Intelligence) کے درمیان پائے جانے والے نازک سے فرق کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ حکمت یا Wisdom ایک باشعور، ذہین اور ایک معقول شخص کی ذہانت کی معراج ہے۔ مستقبل کے لیے فکرمندی کی انتہا ہے۔ غور وفکر کے سلسلے میں اس کی عرق ریزیوں کا ثمر ہے۔ یہ کتابِ ہدایت ہی ہے جو دونوں کے درمیان ایک لطیف فرق کی لکیر کھینچ دیتی ہے اور نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ متاثر کن انداز میں پیش کرتی ہے۔ قرآنُ الحکیم میں جہاں بھی ''اولوالالباب'' کے الفاظ آئے ہیں ان سے ''Wisdom یا حکمت کا استعمال کرنے والے''، ''کل ماجرہ سمجھنے والے'' اور ''اپنی عقل کے دروازے کھلے رکھنے والے''، ''ذہانت کی دولت سے مالا مال لوگ'' ہی مراد لیے گئے ہیں۔

تاہم Wisdom کسی محدود یا مخصوص کیفیت کا نام نہیں ہے۔ یہ کسی کی نقالی یا Immitation کے ذریعہ پیدا کی جانے والی شے بھی نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک ذہین انسان میں حالات کی مناسبت و نزاکت سے اُبھرتی ہے۔ یہ انسان کے شب وروز، اس کے طرزِ زندگی Life Style، اِس کے رویہ، اِس کے ردّعمل کے انداز، اسکے کردار وگفتار سے منعکس ہوتی ہے۔ ایک انسان اپنی ذہانت کے استعمال کے ساتھ جب اپنے رب کی کتاب سے اپنا رشتہ اُستوار اور مستحکم کر لیتا ہے تو کتابِ ہدایت کی آیات اُس کے اندرون وبیرون میں تربیت کا ایک ایسا عمل Process جاری کر دیتی

ہیں جس سے گزر کر انسان کی ایسی نکھری ہوئی شخصیت اُبھرتی ہے جو باکمال ہوتی ہے اور لازماً وہ اپنے اِردگرد کے ماحول میں اُمید کی ایک کرن بن جاتی ہے۔ اُس کے نکھار اور کمالات کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اطراف میں بسنے والوں کے نفع کا سامان فراہم کرتی ہے اور وجہِ فیض یابی بن جاتی ہے۔ اور یہی منزل حکمت کی منزل ہوتی ہے۔ ایسے intelligent اور باکمال شخص کو جو حکمت کی منزل کو پاچکا ہوتا ہے، ''خیرکثیر'' میسّر آجاتا ہے۔ درحقیقت ''خیرکثیر'' ایک ذہین آدمی ہی کی میراث ہوتی ہے۔ ظاہر ہے وہ اِس خیرکثیر کو مستحق بندگانِ خدا میں تقسیم کرنے سے کیسے رُک سکتا ہے!

دوسری سورۃ کی دوسواُنہتر ویں آیت اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ کرتی ہے: ''وہ (اللہ ہی ہے جو) نوازدیتا ہے حکمت، دانائی اور Wisdom سے، جسے وہ چاہتا ہے اور جس کسی کو حکمت و دانائی عطا کی گئی تو اُسے Indeed خیرکثیر سے سرفراز کیا گیا اور (اِن حکمت ودانائی سے لبریز نوازشوں سے لوگ) نصیحت نہیں حاصل کرتے بجز اُن کے جو اپنی عقل کے دروازے کھلے رکھتے ہیں۔''

حکمت و ذہانت اور عقلمندی ودانشمندی سے معمور اشخاص کے لیے کائنات کے ہر ذرے سے ایسے خاموش اِشارے Signals مہیا ہوتے ہیں جسے نادان اپنی نادانی کے باعث حاصل نہیں کرپاتے۔ اِن اشاروں سے ایک دانش مند خاموش رہنمائی اخذ کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ جس کتاب کی ہدایاتِ ربّانی کو اپنی زندگی کا رہنما بنا چکا ہوتا ہے، وہ کائنات میں بکھری ہوئی نشانیوں سے ہم آہنگ ہوتی ہے، کہیں کوئی ٹکراؤ نہیں، کہیں کوئی تضاد نہیں۔ چنانچہ وہ جب بھی اپنے خالق کی فراہم کردہ کتابِ ہدایت سے اپنے لیے احکامات کی روشنی حاصل کرے گا، اُس کی زندگی کے لیے ایک معتدل اور احسن راہ متعین ہوجائیگی، ساری کائنات اُس کی ہمنوا بن جائیگی، اُس کی زندگی بھی فکری تضادات ونظری ٹکراؤ سے پاک ہوگی، اِس راہ پر گامزن ہوکر وہ اپنی مغفرت کی جستجو کرے گا اور فی الواقع یہی اُس کی ذہانت، سمجھداری اور Wisdom کی دلیل بھی ہوگی اور تقاضہ بھی۔

اِس سلسلے میں اُنچالیسویں سورۃ کی اٹھارھویں آیت قابلِ توجہ ہے: ''جو بندگانِ خدا قولِ (دانائی وحکمت) کو توجہ سے سماعت کرتے ہیں، پھر احسن (اور جامع Discipline) کے ساتھ اِس کی اتباع کرتے ہیں، تو یہی لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی اور یہی لوگ ہیں جو اپنی عقل کے دروزے کھلے رکھتے ہیں۔''

تجربہ کہتا ہے کہ جب ایک ذہین انسان کتابِ ہدایت سے رشتہ اُستوار کرلیتا ہے تو اُس کی قابلیتوں اور صلاحیتوں میں اضافہ ہونے لگتا ہے وہ انسانوں کے مجمع میں سب سے ممتاز شخصیت

دکھائی دینے لگتا ہے، چاہے وہ بظاہر روایتی مذہبی آدمی کے حلیہ میں نظر نہ آتا ہو۔ اِس لیے کہ وہ اپنی ذہانت کی حدود سے باہر نکل کر، کتاب اللہ کی برکت سے، حکمت کی حدود میں اپنے آپ کو داخل کر لیتا ہے۔ حالات کو Respond کرتے ہوئے، ان کا تجزیہ کرتے وقت، ان سے نتائج اخذ کرنے کے دوران، لوگوں سے معاملات کرتے ہوئے وہ مسلسل حکمت ودانائی کی معیت و مدد سے مستفید ہونے لگتا ہے۔ اپنے مالک وخالق کی ناراضی اور اسکی گرفت کا حقیقی خوف اُسے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کامرانی سے ہم کنار کرتا ہے۔ کیونکہ ربُّ العالمین کے حاضر و ناظر ہونے کا احساس ذہین اور Wise انسانوں کو مستقلاً راہِ راست پر گامزن رکھتا ہے۔ اِن اصحاب کی خصوصیات کے بارے میں چوبیسویں سورۃ میں سینتیسویں آیت میں ہمیں بڑی واضح تفصیل ملتی ہے: ''(ایسے ہی حاملینِ عزم وارادہ اور ایسے ہی صاحبینِ ایمان) اشخاص ہوتے ہیں جنہیں نہ ان کی تجارت نہ (اُن کی خرید وفروخت اور) لین دین، ذکرِ الٰہی سے (اور اللہ کے Presence کے احساس سے)، اور نماز (جیسی عبادتوں) کے قیام سے، اور زکوٰۃ (جیسے اعمالِ تزکیہ یا Charitable Services) سے کبھی غافل کرنے والی ہیں اور قلوب اور آنکھوں کو تلپٹ کر دینے والے (اُس غضب ناک) دن سے وہ ڈرتے (لرزتے زندگی گزارتے) ہیں۔''

دوسروں سے اُمیدیں وابستہ کرنے کے بجائے، اصحابِ حکمت و دانش، نیکیاں اِکٹھی کرنے کے مواقع کو کبھی نہیں کھوتے۔ اپنے ہم نشینوں کی استعانت کے کسی موقع کو یا اپنے رب کی رضا کی کسی Opportunity کو وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ اِن مواقع کو وہ ایک ایسی چیک سمجھتے ہیں جسے فوراً Cash کرلیا جانا چاہیے۔ حکمت وذہانت کے حامل ایسے ہی نکوکار بندے، اپنی عبادتوں اور چیاریٹیز کے کارہائے سعادت کے ذریعہ اپنے رب کی قدردانی کے مستحق ہوں گے۔

آخر میں ہم بخاری اور مسلم میں درج دو اہم احادیث پیش کرتے ہوئے اپنے مضمون کا اختتام کریں گے: ''وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ: لَا حَسَدَ اِلَّا فِيْ اِثْنَيْنِ ، رَجُل اٰتَاهُ اللّٰهُ مَا لَا فَسَلَّطَهٗ عَلٰى هَلَكَتِهٖ فِى الْحَقِّ وَ رَجُل اٰتَاهُ اللّٰه الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِىْ بِهَا وَ يُعَلِّمُهَا'' (بخاری ومسلم)۔ ترجمہ: ''حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حسد (رشک) صرف دو آدمیوں کے سلسلے میں جائز ہے: ایک وہ شخص جسے اللہ نے مال دیا پھر اُسے حق کی راہ میں لٹانے کی توفیق بخشی، دوسرا وہ شخص جسے اللہ نے حکمت عطا کی تو وہ اُس کے مطابق فیصلے کرتا ہے، اور (لوگوں کو) اِس کی تعلیم دیتا ہے۔''

ایک اور واقعہ بخاری میں ملتا ہے:"وَعَنُ اِبُنِ عَبَّاسٍ قَالَ: ضَمَّنِیَ النَّبِیُّ صَلّی اللّٰہُ عَلَیُہِ وَ سَلَّم اِلیٰ صَدُرِہٖ فَقَالَ اَللّٰھمَّ علِّمُہ الُحِکُمَۃَ و فِیُ رَوَایَۃٍ عَلِّمُہ الکِتَابَ۔"(بخاری) ترجمہ:''حضرت ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنے سینے سے لگایا اور فرمایا: خدایا، اس کو حکمت عطا فرما، ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:''اس کو کتاب (قرآن) کا علم دے۔'' اِسی طرح ترمذی کی ایک روایت ہے کہ ابن عباسؓ نے کہا:"دَعَالِی رَسُوُلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلیہِ وَ سَلَّمَ اَنُ یُّو تِیَنِی اللّٰہُ الُحِکُمَۃَ مَرَّتَیُنِ۔"ترجمہ:''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لیے دومرتبہ دعا کی کہ خدا مجھے حکمت عطا فرمائے۔''

کہیں ایسا نہ ہو کہ گم ہو گمراہی کے رستوں پر
ذہانت، منزلِ حکمت کی جانب گامزن ہوجائے

(ع ب)

❁ ❁ ❁

مصلح کے بھیس میں مفسد ملکی اور عالمی ’’پروہت‘‘

از: ڈاکٹر ایم، اجمل فاروقی
۱۵-گاندھی روڈ، دہرہ دون

آج کی دنیا میں سب سے زیادہ ہنگامہ امن اور سکون کی کمیابی پر ہے۔ مگر یہ مسئلہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا، کی کے مصداق روز بروز سنگین ہوتا جارہا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟ مرض کی تشخیص صحیح نہیں ہے یا معالج ٹھیک نہیں ہے یا معالج کی نیت ٹھیک نہیں ہے؟ معاملہ کیا ہے؟

ملکی اور بین الاقوامی منظر نامہ میں گذشتہ دنوں دو بڑے اہم واقعات ہوئے:

۱- یمن کی راجدھانی صنعاء سے خبر آئی کہ یمن نے اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد سے تعلق رکھنے والے ایک دہشت گرد گروپ کی گرفتاری کا اعلان کیا ہے۔ یمنی صدر علی عبداللہ صالح نے بتایا کہ ۲/۱۰/۲۰۰۸ء کو گرفتار کیے گئے مجرمین کے تعلقات اسرائیلی انٹلیجنس سروس کے ساتھ ہیں اور اُس کو جلد عدالتی کارروائی کے لیے پیش کردیا جائیگا۔ یمنی صدر کا اشارہ راجدھانی صنعاء میں امریکی سفارت خانہ پر حملہ میں ملوث افراد کو حراست میں لیے جانے کی طرف تھا، ستمبر ماہ کی ۱۷/تاریخ کو ہونے والے اس حملہ میں ۱۸ افراد مارے گئے تھے۔ (راشٹریہ سہارا، اردو ۸/۱۰/۲۰۰۸ء)

یہ خبر جتنی اہم تھی اتنی ہی مستعدی کے ساتھ اسرائیل حامی میڈیا کے ذریعہ دبادی گئی۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ایک مسلم ملک میں اسرائیلی ایجنٹ مسلم نوجوانوں کو استعمال کرکے اپنے سب سے قریبی مددگار، ہمدرد اور سرپرست امریکہ کے سفارت خانہ پر حملہ کیوں کرواتا ہے؟ کچھ فوری وجوہات ہوں گی مگر ایک مستقل وجہ امریکی عوام اور حکومت میں مسلم دشمنی کی Booster doses مقوی خوراک وقفہ وقفہ سے دینا ہے تاکہ وہ اسرائیل عرب تنازعہ کو منصفانہ طور پر سلجھانے کی سوچیں بھی نہیں۔ یہیں پر یہودی عیّاری ومکّاری سے بھی سبق لینا چاہیے کہ وہ دنیا بھر میں کتنا اثر ونفوذ رکھتے ہیں اور کتنا منظّم طریقہ پر مکّارانہ چالیں چلتے ہیں۔ کیونکہ بین الاقوامی میڈیا پر بھی صیہونیوں کا ہی قبضہ ہے اس لئے وہ بھی اتنی اہم خبر کو دبا گئے۔

اس کی جڑواں خبر ہمارے ملک سے آج کل دن رات موضوع بحث ہے وہ ہے مختلف انسانیت دشمن بم دھماکوں میں یہودیوں کے نسل برداروں کی تنظیم کی براہِ راست اور بالواسطہ شمولیت کی ہے۔ آج حالات کی چاہے جو مجبوری رہی ہو مگر مظلوموں کا لہو قاتلوں کے ہاتھ سے ٹپکتا دکھایا جانے لگا ہے تو عقلیں حیران ہیں اور حواس ماؤف ہیں کہ کیسے کیسے پاکباز سادھو، سنت، دیش بھگت، مٹھ، مہنت بے گناہوں کے خون کی ہولی بھی کھیلتے رہے اور معصوموں اور بے گناہ نوجوانوں کو قتل وغارت گری میں ملوث کرا کر ان کو اور اہل خاندان کو عذاب میں بھی مبتلا کیے رہے۔ اور اپنے آپ دہشت گردی کے خلاف بند اور ہڑتالیں بھی کرواتے رہے۔ جس نسل پرست، نفرت کی پرچارک تنظیم کی سرپرستی میں یہ کھیل کھیلا جارہا ہے اس کا یہ کھیل نیا نہیں ہے۔ مشہور تاریخ داں امریش مشرا Amrish Mishra اور سبھاش کاتاڈے نے لکھا ہے کہ سنگھ پریوار کا یہ کردار نیا نہیں ہے۔ آئی.سی.ایس افسر راجیشور دیال ہوم سکریٹری آف یوپی کی ۱۹۹۶ء میں شائع شدہ کتاب ''اے لائف آف آور ٹائمس'' A Life of our times ''جب فرقہ وارانہ تناؤ اپنے عروج پر تھا تو ویسٹرن رینج کے D.I.G. بی. بی. ایل حیٹلی رازدارانہ طور پر میرے گھر آئے۔ ان کے ساتھ ان کے دو افسران بھی تھے جو اپنے ساتھ دو اسٹیل کے بڑے ٹرنک بھی لائے تھے۔ اُن بکسوں میں اُن سارے منصوبوں کے دستاویزی ثبوت موجود تھے جس کی بنیاد پر اس صوبہ میں مجرمانہ کارروائیاں انجام دینے کی سازش رچی گئی تھی۔ اُن بکسوں میں پوری مہارت اور پیشہ وارانہ صلاحیت کے ساتھ تیار کیا گیا ہر شہر کا بلیو پرنٹ موجود تھا جس میں اس بڑے خطہ کے مسلم علاقوں اور آبادیوں کی وضاحت کے ساتھ نشاندہی کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ اُس میں مختلف علاقوں تک پہنچنے اور ان علاقوں میں مجرمانہ افعال کو انجام دینے کے بارے میں تفصیلی ہدایات درج تھیں۔ میں ان ثبوتوں کو لے کر وزیراعلیٰ گووند بلبھ پنت کے پاس گیا وہاں حیٹلی نے بند کمرے میں تمام دستاویزی ثبوت اور رپورٹ پیش کی۔ آر.ایس.ایس آفس پر بروقت مارے گئے چھاپوں کے نتیجہ میں ہی یہ سنگین سازش منظر عام پر آئی۔ اور اس کا پلاٹ تنظیم کے سپریمو کی نگرانی میں اور ان کی ہدایت پر تیار کیا گیا تھا۔ حیٹلی اور میں نے اصل مجرم گول والکر کی فوری گرفتاری کے لیے دباؤ بنایا جو کہ اُس وقت علاقہ میں ہی موجود تھے مگر پنت نے اسے کابینہ میں رکھنے کا فیصلہ کیا، کانگریس کے اندر آر ایس ایس سے ہمدردی رکھنے والے کافی لوگ موجود تھے۔ خود قانون ساز کونسل کے سربراہ آتما گووند کھیر آر ایس ایس کے ہمدرد تھے اور ان کے بیٹے بھی آر ایس ایس کے ممبر تھے۔ گول والکر کو گرفتار کرنے کے بجائے ایک خط ان کو بھیجا گیا تھا جس میں حاصل کردہ ان ثبوتوں کی بنیاد پر اُن سے صفائی مانگی گئی تھی۔ جیسا کہ متوقع تھا گول والکر

موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے اس کے بعد پولیس مختلف علاقوں میں چھاپہ مارتی رہی۔ (امریش مشرا، راشٹریہ سہارا، ۲/۱۱/۲۰۰۸ء)

اس کے علاوہ Alexnon Tunzdmann نے اپنی تصنیف "The Indian summer, Secret history of the end of an empire" میں اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۴۷ء میں فرقہ وارانہ فسادات کی قلعی کھولتے ہوئے لکھا ہے ''یہ فسادات نہیں بلکہ آر.ایس ایس کے ذریعہ ریٹائرڈ فوجی افسروں و عملے کے ذریعے ساز باز کرکے نومولود ہندوستانی ریاست کے سیکولر کردار کے خلاف ایک بغاوت وشورش تھی۔ پنڈت نہرو اور سردار پٹیل دونوں ہی اس سازش سے واقف تھے۔ نہرو نے اس وقت سردار پٹیل کو وارننگ دی تھی کہ وہ اس بارے میں فوری فیصلہ کریں کہ وہ کس کے ساتھ ہیں۔ تبھی پٹیل نے فوج کو مسلمانوں کے خلاف اُس بغاوت وشورش کو جس میں لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا تھا کچلنے کی ذمہ داری سونپی تھی۔ (ایضاً)

آج جبکہ ایک بار پھر اس نسل پرست تنظیم کی شیطانی سازشوں کو دنیا دیکھ، سن رہی ہے تو ایسا تاثر دینے کی بھی کوشش کی جارہی ہے کہ شاید یہ چند دنوں پہلے کی بات ہے اور شاید یہ نام نہاد مسلم دہشت گردی کا ردعمل ہے اور دراصل یہ تنظیم ہندوستان کی سچی خیر خواہ ہے۔ بس یہ تو چند ایک لوگ ہیں جو مسلح افواج میں پکڑے گئے ہیں ورنہ زیادہ تر فوج بالکل غیر جانبدار اور سیکولر ہے۔ مگر اوپر کی مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ معاملہ اتنا سیدھا سادھا اور آسان نہیں ہے۔ اس نسل پرست گروہ کے ارادہ ہمیشہ سے پوری ملکی انتظامیہ پر کنٹرول حاصل کرنے کے تھے اسی لیے انھوں نے ۱۹۳۴ء میں ہی مہاراشٹر بھونسلے اسکول کی بنیاد رکھی۔ تب سے آج تک وہاں سے پڑھے ہوئے لاکھوں طلباء کے ذہنوں کو زہر آلود کرکے مسلم دشمنی بھری گئی۔ اس کا اہم نعرہ ''ہندوؤں میں ملٹری ذہن پیدا کرنا اور ملٹری کو ہندو بنانا ہے'' اور اسی کے تحت وہ مستقل عمل پیرا ہے۔ A.T.S مہاراشٹر کی حالیہ تفتیش کے افشاء کے بعد سے صرف ایک خطرناک سازش کو شائع ہونے دیا گیا ہے مگر ایسا نہیں ہے کہ حکومت کو اس کا علم نہ ہو۔ ہندوستان کو ہندو راشٹر بنانے کا خواب دیکھنے والے ۱۹۱۸ء سے ہی منظّم پلان کے تحت آگے بڑھ رہے ہیں۔ اوپر کے دونوں مستند حوالہ اس پر گواہ ہیں۔ آر ایس ایس ایک تنظیم نہیں ہے ایک ذہنیت ہے جو ہر جگہ موجود ہے۔ اپنی ۷۰ سالہ محنت اور انتھک جدوجہد کے بعد انتظامیہ کا کوئی بھی رکن اس کی گرفت سے باہر نہیں ہے صرف درجات کا فرق ہوسکتا ہے۔ عدلیہ اور مسلح افواج سب سے حساس اور کلیدی ادارہ ہیں مگر وہاں بھی جو حال ہے اس کی علامت وقفہ وقفہ سے ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ لیفٹیننٹ کرنل پروہت ایک واحد کیس ہے یا برفانی تودہ کا اوپر

سرا ہے اس کا فیصلہ کرنے کے لئے آج سے ۱۵ سال پہلے ۱۷/اپریل ۱۹۹۸ء کے آؤٹ لک (Out look) کی اشاعت کی مندرجہ ذیل اقتباسات پرغور کرنا ضروری ہے:

''ہندوتو کے لئے ہندوستانی افواج کے اعلیٰ ترین افسروں میں ہمدردی اُس سے بہت زیادہ ہے جتنا سوچا جاتا ہے۔ اسکے شواہد موجود ہیں کہ فوج کی بے داغ وبہترین وردی کے نیچے زعفرانی کچھا موجود ملتا ہے۔ اگر ایسا ہی چلتا رہا تو جلد ہی وہ وقت آئیگا کہ نوکر شاہی کی طرح فوج بھی سیاست زدہ ہوجائیگی اور ہر سیاسی تبدیلی کے ساتھ فوج کے جنرل بھی بدلے جائیں گے۔ (سابق سربراہ بحریہ ایڈمرل جے. جی. ناد کرنی)

فوج پر اثر انداز ہونے کے لیے آر ایس ایس نے بھرتی کے خواہش مند طلباء کی مدد کے مراکز کے ساتھ ساتھ خود اپنی ذیلی تنظیموں کی نگرانی میں چلنے والے ملٹری اسکول بھی کھلوائے ہیں۔ مہاراشٹر میں خود آر ایس ایس کے ہیڈکوارٹر میں ایک ملٹری اسکول چلایا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ مہاراشٹر کے ۳۲ میں سے ۱۴ اضلاع میں ملٹری اسکول قائم کئے جاچکے ہیں۔ پونہ میں صرف خواتین کے لئے اسکول قائم کیا گیا ہے۔ رانی لکشمی بائی موچھی سینک شالا کے کمانڈنٹ کرنل آنند گھوکھلے کا کہنا ہے کہ ''ہم نے اپنے کورس میں N.D.A اور R.S.S کے ملٹری اسکول 'پرہار' کو دھیان میں رکھا ہے۔ طلبہ یہاں گنپتی پوجا، دیوالی، نوراتری مناتے ہیں سلوک پڑھتے ہیں اور گیتا کا جاپ کرتے ہیں مگر اس میں فرقہ واریت نہیں ہے۔ ۳۰ لاکھ سے زائد سبکدوش فوجیوں کی مجبوریوں اور مسائل کا استحصال کرتے ہوئے ان کے ''پوروا سینک پریشد'' کا قیام بابری مسجد کی شہادت کے بعد ۱۹۹۳ء میں یوپی میں ہی ہوا۔ اب تک (۱۹۹۸ء) اس کے ۱۲ سے زائد ریاستوں میں شاخیں قائم ہوچکی ہیں۔ P.S.S.P کے جنرل سکریٹری رنگ کمانڈر کے ایل ناگپال کہتے ہیں کہ سابقہ فوجیوں کی خدمات کو استعمال کرنے کا بہترین طریقہ نوجوانوں کی آر. ایس ایس اور ملٹری اسکولوں میں تربیت کرنا ہے۔ ان تمام کوششوں کے درمیان میں ہی یہ خبر بھی سامنے رہے کہ صرف ۱۹۹۸ء میں ہی ۲۵ ریٹائرڈ جنرلوں نے باقاعدہ B.J.P میں شمولیت اختیار کی'' (اس کے علاوہ B.J.P کے عاملہ کے اجلاس میں فوج کے سربراہان کی شمولیت، پونہ کی نیشنل ڈیفنس اکیڈمی کی تقریب میں جنرل وی. پی. ملک کا ڈائس پر بال ٹھاکرے کے ساتھ موجود ہونا کس بات کی طرف رہنمائی کررہے ہیں؟) (آؤٹ لک ۲۷/اپریل ۱۹۹۸ء)

گرفتار شدہ مبینہ ہندو دہشت گردوں سے پوچھ تاچھ سے انکشاف ہوا کہ انھوں نے صرف ایک بار میں ۵۱-نوجوانوں کو دہشت گردی کے طریقہ سکھائے۔ یہ بھی قبول کیا گیا کہ صرف احمد

آباد کے ایک آشرم میں ہی اب تک ۵۰۰ سے زائد ہندو نوجوانوں کو دہشت گردی کی تعلیم دی گئی (انڈین ایکسپریس ۱۵/۱۱/۲۰۰۸ء ،راشٹریہ سہارا)

تو یہ کہنا ایک طرح سے شترمرغی رویّہ اپنانے جیسا ہوگا کہ یہ حالیہ دنوں میں پیدا ہوئی نام نہاد مسلم دہشت گردی کا یہ ردِّعمل ہے، جبکہ ۱۹۹۸ء کا حال اوپر بیان ہو چکا اور آر ایس ایس کے تأسیسی سربراہ گول والکر کی سازش پر سے پردہ I.C.S افسر راجیشور دیال پہلے ہی پردہ اٹھا چکے ہیں۔ اور ۱۹۴۷ء میں اس تنظیم کے رول پر اور ان کے ساتھ اس وقت کے فوجی افسروں کے رول پر (ریٹائرڈ) Alexnon Tunzelman نے اپنی کتاب میں روشنی ڈالی ہے۔ (امریش مشرا، راشٹریہ سہارا ۲۱/۱۱/۲۰۰۸ء)

ابھی تک پکڑے گئے موجود اور سابقہ فوجی افسران کی پوچھ تاچھ سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ فوج کے ہر بازو میں اس طرح کی ذہنیت سرایت کر گئی ہے۔ کرنل پروہت تو خصوصاً ملٹری خفیہ معلومات کے اہم شعبہ سے وابستہ تھا۔

''۲۰۰۳ء میں ممبئی سے ۶۵ کلومیٹر دور امرناتھ میں مہاراشٹر ملٹری فاؤنڈیشن نامی تنظیم نے ٹریننگ کیمپ منظّم کیا۔ جس کا سربراہ کرنل جینت چتلے تھا۔ اسی موقع پر ہندو نوجوانوں کو کمانڈو اور خودکش بمبار بننے کی تربیت دی گئی۔ اس تقریب میں لیفٹیننٹ جنرل پریم ناتھ ہون مہمان خصوصی تھے۔ جو ریٹائر ہونے سے قبل پوری ویسٹرن کمانڈ کے کمانڈنگ آفیسر تھے۔ بعد میں یہ شیوشینا کے آرمی ویلفیر سیل کے چیف بنے تھے۔ کرنل جینت چتلے کا تعلق بھی پونے سے ہے۔ اسے ۲۰۰۳ء میں گرفتار کیا گیا تھا۔ بعد میں ان کے خلاف پولیس کارروائی نرم کر دی گئی۔ یہاں تک کہ وزیراعلیٰ ولاس راؤ دیش مکھ نے کرنل چتلے اور ان کی ملٹری فاؤنڈیشن کو کلین چٹ دے دی۔ لیکن مالیگاؤں بم دھماکہ کیس میں کرنل چتلے کے ہی تربیت یافتہ فوجی افسر کرنل پروہت کے حراست میں لیے جانے سے ۲۰۰۳ء میں حکومت مہاراشٹر کی چشم پوشی اور غفلت آمیز رویہ پر انگلی اٹھائی جاسکتی ہے۔'' (سعید حمید راشٹریہ سہارا، ۳/۱۱/۲۰۰۸ء)

یمن اور پونے کے درمیان بہت ساری باتیں مشترک ہیں ۱۳/۱۱/۲۰۰۸ء کو بی بی سی ہندی نے صبح 6.30 کی نشریات میں بتایا کہ کرنل پروہت نے بتایا کہ اس نے مسلم نوجوانوں کو بھی اسی طرح کی مدد کی ہے۔ یہودی خفیہ ایجنسی مسلمان نوجوانوں کے ذریعہ اپنے ہی دوست ملک کے آفس پر حملہ کرواتی ہے اور ہمارے یہاں بھی ایسا ہی سازشی روپ دیکھا جارہا ہے۔ ایسا کیوں؟؟

❁ ❁ ❁

تحقیق الکلام فی بیان السبب لوجوب الاحکام

(۲)

از: رشیداحمدفریدی
مدرسہ مفتاح العلوم، تراج، سورت

وجوب فی الذمہ قبل یوم النحر کی تائیدات

مذکورہ بالا دلائل سے یہ حقیقت آشکارا ہوجاتی ہے کہ قربانی کا وجوب فی الذمہ غنا سے ہے وقت پر ہرگز موقوف نہیں ہے۔ مزید تائید کے لیے اضحیہ کے مستحبات پر مشتمل صاحبِ بدائع کا کلام پیش کیا جاتا ہے۔

(فصل) اما الذی هو یستحب قبل التضحیة فیستحب (۱) ان یربط الاضحیة قبل ایام النحر بایام لمافیه من الاستعداد للقربة واظهار الرغبة فیها فیکون له فیه اجر وثواب (۲) وان یقلدها (۳) ویجلّلها اعتبارًا بالهدایا والجامع ان ذلك یشعر بتعظیمها قال اللّٰه ومن یعظم شعائر اللّٰه فانها من تقوی القلوب (٤) وان یسوقها الی المنسك سوقا جمیلا لاعنیفا (٥) ولا یجرّ برجلها الی المذبح کما ذکرنا فی کتاب الذبائح ولو اشتری شاة للاضحیة فیکره (٦) ان یحلبها (۷) او یجزّ صوفها فینتفع به لانه عیّنها للقربة فلا یحل له الانتفاع بجزء من اجزائها قبل اقامة القربة فیها کما لا یحل له الانتفاع بلحمها اذا ذبحها قبل وقتها ولان الحلب والجزّ یوجب نقصا فیها وهو ممنوع عن ادخال النقص فی الاضحیة... ویکره (۸) بیعها لما قلنا... ویکره (۹) له رکوب الاضحیة (۱۰) واستعمالها (۱۱) والحمل علیها (بدائع:۵/۷۸)

یہ مستحبات خاص کرایام نحر سے چند دن قبل جانور کا خریدنا کیونکہ غنی کا اضحیہ خریدنا ایجاب من نفسہ نہیں بلکہ ذمہ فارغ کرنے کے لیے ہے۔ بخلاف الغنی لان الاضحیة علیه بایجاب الشرع ابتداء فلا یکون شراؤه للاضحیة ایجابا بل یکون قصدًا الی تفریغ ما فی ذمته

(کما مرّ) اورمکروہات دلالت کرتے ہیں کہ غنی پر اصل وجوب وقت سے پہلے سے موجود ہے۔ اورعموماً ایسا ہی ہوتا ہے کہ دِنوں، ہفتوں اور بعض مرتبہ مہینوں پہلے جانور خرید کر اس کے ساتھ رغبت ومحبت کا رشتہ قائم کرتے ہیں اور تعظیم واحترام کا معاملہ کیا جاتا ہے۔ امتِ مسلمہ کا یہ معمول اپنے اپنے علاقہ میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

قربانی قربۃ موقتہ ہے

قربانی کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ بالاتفاق قربۃ موقتہ ہے یعنی اس کی ادا مخصوص ایام و اوقات کے ساتھ خاص ہے اس اعتبار سے قربانی دیگر واجباتِ موقتہ نماز، روزہ اور جمعہ کے مشابہ ہے اور موقتات میں وقت بالاجماع شرطِ ادا ہے۔

وکل موقّت فالوقت شرط لاداءہ لانہ لایتحقق بدونہ (تقریر و تحبیر:۱۷۵/۲)

الوقت شرط لاداءھا علی ما عرف فی اصول الفقہ (فتح القدیر:۵۰۷/۹، کتاب الاضحیہ)

وقت ''شرطِ ادا'' کی تفصیل

اور یہ صرف احناف ہی نہیں بلکہ دیگر ائمہ کے نزدیک بھی جن کے یہاں قربانی سنت مؤکدہ ہے بلکہ نفل قربانی کے لیے بھی وقت شرط ادا ہے۔ البتہ اس کی ابتداء وانتہاء میں تفصیل ہے۔

واما شروط صحتھا فمنھا السلامۃ من العیوب... ومنھا الوقت المخصوص فلا تصح اذا فعلت قبلہ او بعدہ وفی بیانہ تفصیل المذاھب.

الحنیفۃ قالو: یدخل وقت الاضحیۃ عند طلوع فجر یوم النحر وھو یوم العید ویستمر إلی قبیل غروب الیوم الثالث وھذا لایختلف فی ذاتہ بالنسبۃ لمن یضحی فی المصر او یضحی فی القریۃ ولکن یشترط فی صحتھا للمصری ان یکون الذبح بعد صلاۃ العید.

المالکیۃ قالو: یبتدئ وقت الاضحیۃ لغیر الامام فی الیوم الاول بعد تمام ذبح الامام ویبتدئ وقتھا للامام بعد الفراغ من خطبتہ بعد صلاۃ العید او مضی زمن قدر ذبح الامام اضحیتہ ان لم یذبح الامام ویستمر وقتھا لآخر الیوم الثالث لیوم العید ویفوت بغروبہ.

الحنابلة قالوا: يبتدئ وقت ذبح الاضحية من يوم العيد بعد صلاة العيد فيصح الذبح بعد الصلاة وقبل الخطبة ولكن الافضل ان يكون بعد الصلاة والخطبة... واذا كان فی جهة لايصلی فيها العيد كالبادية واهل الخيام ممن لاعيد عليهم فان وقت الاضحية يبتدئ فيها بمضی زمن قدر صلاة العيد... وآخر وقت ذبح الاضحية اليوم الثانی من ايام التشريق فايام النحر عندهم ثلثة يوم العيد ويومان بعده.

الشافعية قالوا: يدخل وقت ذبح الاضحية بعد مضی قدر ركعتين وخطبتين بعد طلوع الشمس يوم عيد النحر وان لم ترتفع الشمس قدر رمح ولكن الافضل تاخيره إلى مضی ذلك من ارتفاعها ويستمر إلى آخر ايام التشريق الثلثة. (الفقه علی مذاهب الاربعة:۱/۷۲۱)

بجز امام شافعیؒ کے سب کے نزدیک منتہائے وقت ۱۲ویں کا غروب ہے اور ابتدائے وقت سوائے امام اعظمؒ کے سب کے نزدیک تقریباً نمازِ عیدالاضحیٰ کے بعد شروع ہوتا ہے اس میں شہری و دیہاتی کا کوئی معتد بہ فرق نہیں ہے اور امام اعظمؒ کے نزدیک اصل وقت جمیع مکلفین کے حق میں صبح صادق سے ہی شروع ہوجاتا ہے البتہ ذبح فی المصر کے لیے فراغ من صلاۃ العید مزید شرط ہے۔

صلاۃ عید ذبح فی المصر کی شرطِ مزید ہے

ثم يختص جواز الاداء بايام النحر وهی ثلثة ايام عندنا قال عليه الصلاة والسلام ايام النحر ثلثة افضلها اولها فاذا غربت الشمس من اليوم الثالث لم تجز الاضحية بعد ذلك. (مبسوط:۹/۱۲)

ثم اول وقت التضحية عند طلوع الفجر الثانی من يوم النحر الا ان فی حق الامصار يشترط تقديم الصلاة علی الاضحية فمن ضحّی قبل الصلاة فی المصر لاتجزيه لعدم الشرط لا لعدم الوقت ولهذا جازت التضحية فی القری بعد انشقاق الفجر ودخول الوقت لايختلف فی حق اهل الامصار والقری وانما يختلفون فی وجوب الصلاة فليس علی اهل القری صلاة العيد. (مبسوط:۱۰/۱۲)

فلا يجوز لاحد ان يضحّی قبل طلوع الفجر الثانی من اليوم الاول من ايام النحر ويجوز بعد طلوعه سواء كان من اهل المصر او من اهل القری غير ان للجواز

فی حق المصر شرطاً زائدا وهو ان یکون بعد صلاة العید لایجوز تقدیمها علیه عندنا. (بدائع:٥/٧٣)

شہر میں قربانی صحیح ہونے کے لیے صلاۃِ عید کی ادائیگی دوسری اہم شرط ہے حتی کہ نماز سے قبل ذبیحہ اضحیہ نہیں کہلائیگا۔ ان اول نسکنا فی هذا الیوم الصلاة ثم الاضحیة فمن ذبح قبل الصلاة فلیُعد ذبیحته ومن ذبح بعد الصلاة تم نسکه واصاب المسلمین. (مبسوط:١٢/١٤)

گویا شہر میں نماز عید کے بعد وقت شروع ہوتا ہے لہٰذا نماز سے قبل ذبح کرنا ایسا ہے جیسے صبح صادق سے پہلے ذبح کرنا۔

غالبًا اسی وجہ سے بعض فقہاء کے کلام میں عبارت اس طرح ہے۔ اول وقتها بعد الصلاة ان ذبح فی المصر ای بعد صلاة العید یوم النحر وبعد طلوع فجر یوم النحر ان ذبح فی غیره. (شرح وقایه:٤/٣٩)

وقت شرط اور سبب دونوں کا جامع ہے

بہرحال ائمہ اربعہ کے نزدیک ایام نحر مطلق قربانی کے لیے شرط ادا ہے۔ اور واجب قربانی کے لیے واجبات موقتہ میں سے حج اور جمعہ کو چھوڑ کر یعنی نماز، روزہ کے وقت کی طرح بعینہٖ اسی وقت کو شرط ادا کے ساتھ وجوب ادا کا سبب بھی قرار دیا گیا ہے، لہٰذا وقت دو حیثیتوں کا جامع ہوا۔

لاتجوز قبل دخول الوقت لان الوقت کما هو شرط الوجوب فهو شرط جواز اقامة الواجب. (بدائع:٥/٧٣)

ولا نزاع فی سببیّة ذلك ومما یدل علی سببیة الوقت امتناع التقدیم علیه کامتناع الصلاة. (بنایه:١١/٣)

فان قلت جعلت الوقت سببًا فکیف یکون شرطاً قلتُ هو سبب للوجوب وشرط للاداء (عنایه علی هامش الفتح:١/٢١٦)

وقد یجامع الشرط السبب مع اختلاف النسبة کوقت الصلاة فانه شرط بالنسبة إلی الاداء وسبب بالنسبة إلی وجوب الاداء. (تقریر:٢/١٠٢)

اور موقتات کی ادا، جس طرح قبل الوقت صحیح نہیں ہے اسی طرح وقت کے بعد بھی صحیح نہیں ہے بلکہ قضاء لازم ہوتی ہے۔

ولم يقل احد بصحة اداء الموقتات بعد مضى وقتها... فان التضحية اراقة الدم وهى انما تقبل فى وقت الاداء لابعده وانما الذى يلزم بعده قضاء ها (فتح القدير:٥٠٧/٩)

اما بعد مضى ايام النحر فقد سقط معنى التقرب باراقة الدم لانها لاتكون قربة الا فى مكان مخصوص وهو الحرم او فى زمان مخصوص وهو ايام النحر.(مبسوط:١٤/١٢)

... ويفوت بمضى الوقت فلا تجب عليه بمنزلة الجمعة (هدايه آخرين:٢٤٤)

قربانی کی قضاء اور جمعہ سے مشابہت

صاحب ہدایہ کے بمنزلة الجمعه کہنے سے چند امور کی طرف اشارہ ہوا:

(۱) ایک یہی جو اوپر مذکور ہوا یعنی وقتِ جمعہ ادائے جمعہ کے لیے شرط ہے اور جمعہ کے وجوب کے شرائط دوسرے ہیں اسی طرح صحۃ اضحیہ کے لیے وقت شرط اداء ہے اور وجوب فی الذمہ کے شرائط دیگر ہیں۔

(۲) وقت کے اعتبار سے اصل فریضہ ظہر ہے مگر سیدالایام کی خاص شان واہمیت کے پیش نظر بجائے ظہر کے صلاۃ جمعہ کے ذریعہ فریضہ کی ادائیگی کافی سمجھی گئی ان اصل الفرض هو الظهر فى حق الكافة... الا انه مامور باسقاطه باداء الجمعة (هدايه:١٧٠/١) اسی طرح قربانی حق مالی ہونے کی وجہ سے اصل وظیفہ تصدق ہونا چاہئے تھا مگر ایام اضحیہ کی خاص شان کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مومنین کی ضیافت ہوتی ہے بجائے تصدق کے اراقۃ الدم کو قائم مقام کردیا گیا۔ كما مرّ (بدائع،حسامى)

(۳) وقت گذر جانے پر ادائے جمعہ فوت ہوگئی اب جمعہ اداء نہیں ہوسکتی اسی طرح ایام نحر گذر جانے سے اراقۃ الدم سے قربت اداء نہ ہوگی ولا سبيل إلى التقرب بالاراقة بعد خروج الوقت (بدائع:٦٨/٥، مبسوط: ١٤/١٢)

(۴) وقت گزر جانے کے بعد قضاء نہ بمثل معقول ہے جیسے نماز پنج گانہ میں اور نہ بمثل غیر معقول ہے جیسے روزہ کی قضاء فدیہ سے بلکہ وقت کا جو اصل فریضہ تھا یعنی ظہر اس کی قضاء کی جاتی ہے۔ اسی طرح ایام نحر گذر جانے کے بعد قضاء نہ بمثل معقول ہے اور نہ (علی الاطلاق) بمثل غیر معقول ہے بلکہ غنا کی وجہ سے اصلاً جو حکم عائد ہوتا ہے یعنی تصدق وہی حکم ذمہ میں باقی رہتا ہے۔

وقد تقرر ان القضاء قد يكون بمثل معقول كالصلاة للصلاة وقد يكون بمثل غير معقول

کالفدیة للصوم وثواب النفقة للحج وعدّوا الاضحیة من القسم الثانی وقالوا ان اداء ها فی وقتها باراقة الدم وقضاء ها بعد مضی وقتها بالتصدق بعینها وبقیمتها (تکملہ فتح:۹/۵۰۷)

لاتقضی بالاراقة لان الاراقة لاتعقل قربة وانما جُعِلتُ قربة بالشرع فی وقت مخصوص فاقتصر کونها قربة علی الوقت المخصوص فلا تقضی بعد خروج الوقت ثم قضاء ها قد یکون بالتصدق بعین الشاة حیةً وقد یکون بالتصدق بقیمة الشاة (بدائع:۵/۶۸)

قبل از وقت قربانی صحیح نہ ہونے کی وجوہات

(۱) مذکورہ تفصیل سے بخوبی معلوم ہوگیا کہ غنی شخص ایام نحر سے قبل قربانی اس لیے نہیں کرسکتا کہ وقت شرطِ ادار ہے اور تقدم المشروط علی شرط الصحة جائز نہیں ہے۔

(۲) قربانی قربۃ معقولہ ہے اس لیے اس کی ادائیگی وقت کے ساتھ مقید ہے نہ قبل از وقت جائز ہے اور نہ وقت کے بعد۔ کما مر.

(۳) وقت سبب وجوبِ ادار بھی ہے اور مسبب سبب پر مقدم نہیں ہوتا پس قربانی وقت وجوبِ ادار سے پہلے جائز نہیں اور یہی قیاس کا تقاضہ بھی ہے۔ غالباً اسی وجہ سے حسن بن زیادؒ اور امام مالکؒ صدقۃ الفطر اور زکوۃ میں وقتِ وجوب ادار یعنی صبح یوم الفطر اور حولانِ حول سے قبل ادار کو جائز نہیں کہتے ہیں مگر چونکہ خلاف قیاس نص سے اخذ زکوٰۃ قبل حولان الحول اور صبح یوم الفطر سے پہلے ادائے صدقہ ثابت ہے اس لیے ائمہ ثلثہ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ جوازِ تقدیم کے قائل ہیں۔ (بنایہ:۳/۵۹۵)

وقت سے پہلے قربانی صحیح نہ ہونے کی وجہ غنی کے حق میں بھی وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی نہ یہ کہ غنی کا ذمہ ابھی مشغول بالواجب ہی نہیں ہوا ہے۔

تعقب الفرید علی تخصیص الوجوب بصبح العید

مذکورہ تفصیلات سے یہ چند امور محقق ہوئے: (۱) اصلِ وجوب (نفسِ وجوب) کا ثبوت مکلّف کی صفات پر موقوف ہے (۲) وجوبِ ادار (یعنی فرضیت ووجوب) خطابِ الٰہی کے ذریعہ مختص ہے اوقاتِ معینہ کے ساتھ (۳) سبب کے تکرار وتعدد سے وجوب مکرر ہوتا ہے (۴) قربانی مالی عبادت ہے اور اس کے نفس وجوب کی علت بالاتفاق غنی (یعنی ملکِ نصاب ہے) (۵) قربانی کے وجوب ادار کا تعلق اضحیہ (جانور) سے ہے نہ کہ مکلّف سے (۶) اور ادار کے لیے وقت کا اعتبار

محلِ ادا، کے لحاظ سے ہے جیسا کہ آئندہ مفصل آرہا ہے۔

اب اس کے بعد جدید موقف پر دیے گئے فتاویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

دارالعلوم کراچی کا فتویٰ

۱۵ر شعبان ۱۴۲۰ھ میں دارالافتاء کراچی (پاکستان) سے قربانی سے متعلق ایک فتویٰ دیا گیا جس پر ارباب افتاء کے دستخط بھی ہیں یہ فتویٰ رسالہ ''البلاغ'' کراچی فروری ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔

متنِ فتوی کی عبارت یہ ہے:

الجواب حامدا ومصلیًا قربانی کے نفس وجوب کا سبب وقت ہے جو کہ یوم النحر کے طلوع صبح صادق سے شروع ہوکر بارہویں تاریخ کے غرب آفتاب تک ہے اور ''غنیٰ'' یعنی مالک نصاب ہونا یہ شرط وجوب ہے اور مثلاً شہری کے حق میں قربانی کا نمازِ عید کے بعد انجام دینا یہ شرط ادا، ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ یوم النحر کے طلوع صبح صادق سے پہلے قربانی کا سرے سے وجوب ہی نہیں ہوتا جیسا کہ نماز ہے کہ وقتِ نماز داخل ہونے سے پہلے نماز فرض ہی نہیں ہوتی لہٰذا اگر کسی نے وقت داخل ہونے سے پہلے نماز ادا، کی تو فرض ادا نہیں ہوگا اسی طرح اگر کسی نے یوم نحر سے پہلے قربانی کی یا کرائی تو وہ بھی شرعاً معتبر نہیں ہوگی... لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ ''ادا،'' کا اعتبار اس وقت ہوگا جب اس عمل کا پہلے مکلّف کے ذمہ نفس وجوب ہو چکا ہو جیسا کہ شروع میں مذکور ہوا کیونکہ وجوب سے قبل ادا، کا اعتبار نہیں اور نفس وجوب کا تعلق ذمہ مکلّف سے ہوتا ہے اور ذمہ کا محل مکلّف ہے مال نہیں لہٰذا نفس وجوب میں مکلّف (فاعل) کے محل کا اعتبار ہوگا اور نفس وجوب کا سبب یوم نحر ہے جیسا کہ گذشتہ صفحہ میں مذکور ہوا لہٰذا نفس وجوب میں یہ دیکھا جائے گا کہ جہاں مضحّی (قربانی کرنے/ کرانے والا) رہ رہا ہے وہاں یوم نحر ہو چکا ہے یا نہیں اگر یوم نحر ہو چکا ہے تو نفس وجوب ہو گیا اب دیگر شرائط کے پائے جانے کی صورت میں خود قربانی یا اس کی اجازت سے دوسرا کوئی آدمی کرے دونوں صورتوں میں یہ قربانی شرعاً ادا ہو جائے گی لیکن مضحی جہاں رہ رہا ہے وہاں یوم نحر اگر نہیں ہوا ہے تو جس طرح اِس وقت یہ خود قربانی نہیں کرسکتا اسی طرح اس کی طرف سے کوئی اور بھی نہیں کرسکتا اگرچہ وکیل (دوسرا شخص) کے شہر یا ملک میں یومِ نحر شروع ہو چکا ہو۔ (البلاغ: ۴۷، ۴۸)

جناب مفتی صاحب نے متعدد کتب فقہ سے عبارت نقل کی ہے کہ غنا شرط وجوب ہے اور وقت ''سبب وجوب'' ہے۔ یہ بات بالکل مسلم ہے، مگر سبب وجوب کا مطلب مراد لینے میں اصولی

طور پر لغزشیں واقع ہوئی ہیں: (۱) وجوب سے نفس وجوب ہی مراد لیا گیا۔ (۲) نفس وجوب کو سبب کے لفظ کے ساتھ خاص کر دیا گیا۔ (۳) سبب کو سبب فی معنی العلۃ لیا گیا۔ مگر یہ استدلال مخدوش ہے۔ کیونکہ

(۱) وجوب کی دو قسمیں ہیں وجوب ادا، اور نفس وجوب اور وجوب ادا، مطلوب ہے اس لئے کہ ادا، مقصود ہے اور ادا، مقید بالوقت ہے پس وقت خاص کے ساتھ جو وجوب متعین ہے وہ وجوب ادا، ہے جیسا کہ گذشتہ اوراق میں ثابت کیا جا چکا لہٰذا فقہاء کے نزدیک سبب وجوب سے مراد سبب وجوب ادا، ہے۔

(۲) نفس وجوب کچھ صفات کے ساتھ مختص اور اس پر مبنی ہے خواہ اسے سبب بھی کہا گیا ہو یا شرط جیسے ملک نصاب وجوب زکوٰۃ کے لیے سبب ہے اور صدقۃ الفطر کے حق میں شرط ہے اور گو وجوبِ صدقہ کی اضافت رأس یمونہ کی طرف ہے مگر ملک نصاب (غنا) کے بغیر ذمہ مشغول بالواجب ہوتا ہی نہیں۔ پس جب صفات کا تحقق ہوگا نفس وجوب ہو جائے گا اور اگر وقت خاص للادا، میں تحقق ہو رہا ہے تو ذمہ کی مشغولیت ان صفات کی وجہ سے ہوتی ہے نہ کہ وقت کی وجہ سے البتہ وقت خاص خطاب الٰہی کی معرفت کا ذریعہ ہے جو وجوب ادا، کا حقیقی سبب ہے۔ پس وقتِ خاص ہی کو نفس وجوب کا سبب سمجھنا اصول کے خلاف ہے۔

(۳) سبب کی کئی قسمیں ہیں ایک سبب فی معنی العلۃ ہوتا ہے جیسے ملک نصاب وجوب زکوٰۃ کے حق میں علّت ہے۔ ایک سبب محض بھی ہوتا ہے جو فقط مُفضِی الی الحکم ہے نہ کہ مؤثر فی الوجوب جیسے اوقات مخصوصہ موقّتات کے لیے پس قربانی کے سبب وجوب کو زکوٰۃ کے سبب وجوب پر قیاس کر کے قربانی کے سبب یعنی وقت کو مؤثر فی الوجوب ماننا قیاس مع الفارق ہے۔

(۴) غنا کو شرط وجوب کہا گیا ہے کما فی کتب الفقه وهو الصحيح۔ مگر جناب مفتی صاحب اسے اہلیت وجوب یعنی اصل وجوب کی شرط کے بجائے فقط شرط وجوب ادا، سمجھ رہے ہیں جیسا کہ ان کی عبارت دلالت کر رہی ہے ''لہٰذا نفس وجوب میں یہ دیکھا جائے گا کہ جہاں مضحی (قربانی کرنے/کرانے والا) رہ رہا ہے وہاں یوم النحر ہو چکا ہے یا نہیں اگر یوم النحر ہو چکا ہے تو نفس وجوب ہو گیا اب دیگر شرائط کے پائے جانے کی صورت میں خود قربانی کرے یا اس کی اجازت سے دوسرا کوئی آدمی کرے دونوں صورتوں میں یہ قربانی شرعاً ادا، ہو جائے گی الخ'' حالانکہ جمیع فقہاء کے نزدیک وجوب اضحیہ کی علّت قدرۃ علی النصاب ہے۔ پس غنا اصلِ وجوب

کی شرط ہے یعنی غنا ہی کی وجہ سے مکلّف کا ذمہ مشغول بالواجب کہلائے گا کیونکہ اصل وجوب کا محل بہرحال ذمہ المکلّف ہے اِس اصل وجوب کے بعد ہی وقت مخصوص میں وجوب ادا متحقق ہوگا ورنہ نہیں۔

(۵) قربانی کا وقت نماز، روزہ کے اوقات کی طرح سبب وجوب (ادا) ہے پھر بھی دونوں میں فرق ہے کہ نماز، روزہ میں وجوبِ ادا کا محل خود مکلّف ہی کی ذات ہے کیونکہ وجوب جس ادا کی صفت ہے اس کا محل قیام ذاتِ مکلّف ہے پس وقت کی آمد پر نماز، روزہ کا وجوب مکلّف کے ذمہ ہی ہوگا یعنی وقت میں ذمہ مشغول بالواجب ہورہا ہے اور اسی کو عرف میں فرضیت سے تعبیر کرتے ہیں مگر حقیقت میں یہ بلحاظِ اصطلاح وجوبِ ادا ہے جس میں وجوب متصل بالادا رہتا ہے باقی وہ نفس وجوب جو وجوب ادا کا مقابل اور اس سے منفک ومقدم ہوتا ہے اس کا مبنیٰ صفاتِ مکلّف ہے نہ کہ وقت۔ لہٰذا نماز، روزہ میں تو وقت کی آمد پر یہ کہنا صحیح ہے کہ وجوب فی الذمہ بسبب الوقت ہے مگر اس پر قیاس کرتے ہوئے قربانی کے بارے میں یہ کہنا کہ وقت کی آمد پر ہی وجوب ذمہ میں آئے گا درست نہیں ہے کیونکہ یہاں وجوبِ ادا کا محل جانور ہے اور ذمہ کا مشغول بالواجب ہونا غنا سے ہے جو وجوبِ اضحیہ کی علت ہے۔

مفتی عمر فاروق لندن کے فتویٰ کی تائید

کراچی کے مذکورہ فتویٰ کے چند سال بعد لندن میں مولانا عمر فاروق صاحب زید مجدہ نے اُنہی سابقہ بنیادوں پر ذی قعدہ ۱۴۲۴ھ کو فتویٰ دیا اور مزید براں مفتی صاحب نے حضرت مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوری نوراللہ مرقدہ کے اس نوع کے فتویٰ کو مبنی برتسامح بتایا۔ اور پھر مولانا اسمٰعیل گنگات صاحب مدظلہ کے توسط سے حضرت اقدس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب ادام اللہ ظلالہ علینا سے یہ لکھ کر استصواب کیا۔

...''بندہ کہتا ہے کہ فتاویٰ رحیمیہ کا فتویٰ مبنی برتسامح ہے اور ہدایہ آخرین/۴۳۰ اور الدرالمختار وردالمحتار جلد۵/۲۷۸ کی جن عبارات کو حضرت مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوری قدس سرہ (مفتی اعظم گجرات، انڈیا) نے بطورِ دلیل ذکر فرمایا ہے ان کا تعلق نفسِ وجوب آجانے کے بعد سے ہے کہ نفسِ وجوب آجانے کے بعد قربانی کا جانور جس جگہ ہو اُس جگہ کا اعتبار ہوتا ہے قربانی کرانے والے کی جگہ کا اعتبار نہیں ہوتا۔'' حضرتِ والا سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ اگر بندہ کے

جواب میں سقم اور غلطی ہو تو اصلاح فرمادیں اور اگر بندہ کا جواب صحیح ہو تو تائید فرمادیں۔

حضرت مولانا مفتی تقی صاحب عثمانی مدظلہ العالی نے ان الفاظ میں تائید فرمائی:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی مولانا اسماعیل گنگات صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

قربانی کے بارے میں مولانا مفتی فاروق ڈیسائی صاحب کا فتویٰ موصول ہوا۔ بندے کو اس سے اتفاق ہے اور ان کے دلائل قوی ہیں اور فتاویٰ رحیمیہ میں تسامح ہے کیونکہ جو عبارت نقل کی ہے اس میں قربانی بعد الوجوب ہے جبکہ زیر بحث مسئلہ میں قربانی قبل سبب الوجوب واقع ہو رہی ہے نیز احتیاط اس میں ہے کہ جب قربانی کسی ملک میں کی جائے تو جس شخص کی طرف سے قربانی کی جارہی ہے اس کے ملک میں بھی ایام اضحیہ ختم نہ ہوئے ہوں۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

بندہ محمد تقی عثمانی عفی عنہ

نوٹ: حضرت مفتی سید عبدالرحیم صاحبؒ کا فتویٰ شروع رسالہ ''نگاہِ اولین'' میں درج کیا گیا ہے۔ دارالافتاء دارالعلوم کراچی ۱۴ ۱۶/۱۱/۱۴۲۵ھ

تائید صحیح نہیں ہے

تائید سے حضرت کی مراد غالباً یہی ہے کہ کتب فقہ کی وہ عبارتیں جن کو حضرت مفتی سید عبدالرحیم صاحبؒ نے نقل کی ہیں اس کا تعلق بعد نفس الوجوب ہے جبکہ زیر بحث مسئلہ میں قربانی قبل سبب نفس الوجوب واقع ہو رہی ہے، اس لیے کہ نفس وجوب وقت سے ہوتا ہے (کما فهمه ارباب الفتاویٰ من لفظ "سبب الوجوب")

بندہ عرض کرتا ہے کہ حضرت کی یہ تائید مبنی بر خطأ ہے اس لیے کہ فقہاء کی عبارت کا تعلق جب بعد الوجوب سے ہے تو نفس وجوب یعنی ذمہ کے مشغول بالواجب ہونے کی بنیاد اور علّت غنا ویسار ہے نہ کہ وقتِ اضحیہ۔ اور سبب وجوب سے مراد وقتِ وجوب ادا، ہے اور اِسی سبب میں انتقال پایا جاتا ہے کما سبق مفصلا لہٰذا غنی کی قربانی دوسرے مقام پر وہاں کے ایام اضحیہ میں جب بھی کی جائے گی قبل سبب الوجوب نہیں بلکہ بعد سبب الوجوب ہی ہوگی۔

لہٰذا حضرت مفتی سید عبدالرحیم صاحبؒ کا فتویٰ فقہ واصول فقہ کی روشنی میں صحیح اور درست

ہے اس میں قطعی طور پر کوئی تسامح اور لغزش نہیں ہے۔ فللّٰہ در الفقیہ.

شاہی مرادآباد کا فتویٰ

شاہی مرادآباد کے حضرت مفتی شبیر احمد صاحب زید فضلہ نے ۲۳ر صفر ۱۴۲۵ھ کو فتویٰ لکھا جو بقول مفتی محمد سلمان منصور پوری زید مجدہ دارالعلوم کراچی اور حضرت مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوریؒ کے فتویٰ کے مابین ایک محاکمہ ہے یہ فتویٰ ندائے شاہی کے شمارہ جنوری ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔

حضرت مفتی صاحب نے اصول کے اُن ہی مفاہیم کے پیش نظر فتویٰ تحریر کیا ہے جن کو کراچی کے فتویٰ میں بنیادی حیثیت حاصل ہے اس لیے سابقہ خطائیں یہاں بھی موجود ہیں بلکہ مزید واقع ہوئی ہیں۔

الجواب وباللّٰہ التوفیق... حامدا و مصلیا و مسلّما

اس مسئلہ میں تین چیزوں کو الگ الگ سمجھنا لازم ہے (۱) سبب وجوب یعنی قربانی واجب ہونے کا سبب یہ قربانی کا وقت ہے جو یوم النحر کے طلوع صبح صادق سے شروع ہوکر بارہویں تاریخ کے غروب آفتاب تک رہتا ہے (۲) شرطِ وجوب یعنی قربانی واجب ہونے کی شرط آزاد مسلمان کا مالک نصاب ہونا (۳) شرط ادا، یعنی مالک نصاب پر قربانی کے ایام اور وقت داخل ہونے کی وجہ سے قربانی واجب ہوجاتی ہے پھر اسکے قربانی ادا، کرنے کے لیے ایک مزید شرط ہے وہ یہ ہے کہ شہری آدمی کیلئے نماز عیدالاضحیٰ کی ادائیگی لازم ہے یہی شہری کے لیے ادائیگی کی شرط ہے مگر یہ شرط دیہاتی پر لاگو نہیں ہوتی اور شرط ادا، میں مکان اضحیہ کا اعتبار ہے مکان مضحّی کا اعتبار نہیں لہٰذا جہاں جانور ہوگا وہاں کا اعتبار ہوگا اور جہاں مالک ہو وہاں کا اعتبار نہیں یہ مسئلہ صرف تیسری شرط کے اعتبار سے ہے اور پہلی اور دوسری شرط کے وجوب کے بغیر تیسری شرط کا تصور ہی نہیں ہوسکتا، لہٰذا سب سے پہلے اول شرط یعنی دونوں جگہ قربانی کے زمانہ کا آنا لازم ہے پھر شرطِ ثانی یعنی زمانۂ قربانی میں مسلمان کا مالکِ نصاب ہونا ان دونوں شرطوں کے ایک ساتھ پائے جانے کے بعد تیسری کا مسئلہ سامنے آتا ہے اور تیسری شرط ایک خصوصی اور جزوی شرط ہے عمومی اور کلی نہیں صرف شہری کے ساتھ یہ شرط لگی ہوئی ہے۔ دیہاتی کے ساتھ نہیں لہٰذا شہری اور دیہاتی کے اعتبار سے مکان اضحیہ کا اعتبار ہوگا مکانِ مضحّی کا اعتبار نہیں۔ فتویٰ رحیمیہ اور مسائل قربانی میں مسامحت ہوگئی ہے کہ اس میں تیسری شرط کو سببِ وجوب یعنی پہلی شرط کے درجہ میں لے جا کر لکھا گیا ہے جو درست نہیں ہے اور

ساتھ میں ہدایہ، درمختار اور شامی کے تین جزئیہ بھی نقل کیے ہیں ان تینوں جزئیات کا تعلق تیسری شرط کے ساتھ ہے پہلی شرط کے ساتھ نہیں ہے ان جزئیات کو اس مسئلہ سے متعلق سمجھنے میں مسامحت ہوگئی ہے۔ الخ (ندائے شاہی شمارہ جنوری ۲۰۰۵ء)

(۶) اول: یہاں حضرت مفتی صاحب سے مزید ایک خطأ یہ ہوئی بلکہ یہ خطا بھی کراچی کے فتویٰ میں موجود ہے کہ شرط اداء سے فقط نماز عیدالاضحیٰ کی ادائیگی مراد لی ہے جو کہ شہری کے ساتھ خاص ہے حالانکہ وقت (ایام نحر) خود شرط اداء ہے جو واجب اور نفل دونوں قربانیوں کے لیے ہے خواہ شہر میں ہو یا دیہات میں اور فقہاء شرط اداء سے اوّلاً یہی وقت مراد لیتے ہیں الوقت شرط لادائها على ما عرف فی اصول الفقه (فتح القدير) کیونکہ واجب کی طرح نفل قربانی بھی موقت ہے بخلاف نفل نماز، روزہ کے اور یہ شرط اداء ہر ایک کے حق میں ہے البتہ صلاۃ العید کی ادائیگی یہ مزید شرط ہے شہر میں قربانی کے لیے۔ فلا يجوز لاحد ان يضحى قبل طلوع الفجر الثانی من اليوم الاول من ايام النحر ويجوز بعد طلوعه سواء كان من اهل المصر او من اهل القرى غير ان للجواز فی حق اهل المصر شرط زائد وهو ان يكون بعد صلاة العيد لايجوز تقديمها عليه عندنا. (بدائع: ۵/۷۳)

(۷) دوم: اسی پر دوسری خطأ مرتب ہوئی کہ مکان اضحیہ کا اعتبار جس کا تعلق دراصل شرطِ اداء یعنی وقت (ایام نحر) سے ہے اور اہل مصر و قریہ دونوں کے حق میں عام اور کلی ہے۔ مفتی صاحب نے اسے شرط زائد کے ساتھ جوڑ کر اعتبار مکان اضحیہ کے ضابطہ کو جزوی بنادیا دیکھئے مسئلہ... نمبر (۳) میں شرط اداء سے نماز عیدالاضحیٰ مراد لی ہے پھر لکھتے ہیں ''شرط اداء میں مکان اضحیہ کا اعتبار ہے'' اور آگے لکھتے ہیں ''تیسری شرط خصوصی اور جزوی ہے''۔

(۸) سوم: مفتی صاحب نے اپنے فتویٰ میں مکان اضحیہ و مکان من علیہ الاضحیہ دونوں کے حق میں وقتِ وجوب کو ضروری قرار دیتے ہوئے یوم النحر سے پہلے (باوجود غنا کے) نفس وجوب نہ ہونے پر ایک خاص جزئی (مثال) پیش کی ہے۔

''اگر ہندوستان کا آدمی سعودی عرب قربانی کا پیسہ بھیج دیتا ہے اور وہاں ہندوستان سے ایک دن پہلے قربانی کا دن شروع ہوجاتا ہے ہندوستان میں ابھی قربانی کا زمانہ شروع ہی نہیں ہوا اب اگر مالکِ قربانی ہندوستان میں اسی دن مرجاتا ہے تو اس پر قربانی واجب ہی نہیں ہوئی حالانکہ مکان اضحیہ میں جہاں قربانی ہونی ہے وہاں پر وقت ہو چکا تھا۔ لہٰذا مکانِ اضحیہ اور مکان مالک

دونوں جگہ قربانی کا سبب وجوب یعنی دسویں ذی الحجہ کی صبح صادق کا ہونا شرط ہے۔''

یہ استشہاد دو وجہ سے صحیح نہیں ہے۔

(۱) ایک یہ کہ اکنافِ عالم سے حرم میں قربانی کے لیے ہدی بھیجنے کا شریعت کی روشنی میں قدیم دستور رہا ہے حالانکہ ہدی بھیجنے والے اور ذبح فی یوم النحر کے درمیان اوقات کا بیّن فرق بلکہ اکثر قمری تاریخ کا بھی اختلاف ہوتا رہتا ہے کما ستطلع علیه.

(۲) دوسری یہ کہ مالکِ اضحیہ کا یوم النحر سے پہلے مرجانے پر کیا انحصار ہے مالک اضحیہ کے اعتبار سے وقت آجانے کے بعد بھی اگر اضحیہ ایام نحر میں ذبح نہیں کیا گیا ہے اور مالک مرگیا تو بھی وجوب نہیں ہوا۔

ولو مات الموسر فی ایام النحر قبل ان یضحی سقطت عنه الاضحیة وفی الحقیقة لم تجب لما ذکرنا اَنّ الوجوب عند الاداء او فی آخر الوقت فاذا مات قبل الاداء مات قبل ان تجب علیه کمن مات فی وقت الصلاة قبل ان یصلیها انه مات ولا صلاة علیه کذا ههنا (بدائع:۵/۶۵)

یہی نہیں بلکہ ایام نحر میں ادا سے قبل فقر لاحق ہوگیا تب بھی وجوب ساقط ہوجائیگا۔ معلوم ہوا کہ وجوب فی الذمہ کا مُوجِب وقت نہیں ہے بلکہ غنا و یسار ہے۔

موسر اشتری شاةً للاضحیة فی اول ایام النحر فلم یضح حتی افتقر قبل مضی ایام النحر او انفق حتی انتقص النصاب سقطت عنه الاضحیة وان افتقر بعد ما مضت ایام النحر کان علیه ان یتصدق بعینها او بقیمتها ولا یسقط عنه الاضحیة (فتاویٰ قاضیخان بهامش العالمگیری:۳/۳۴۶)

فتاویٰ رحیمیہ کی تصحیح اور اس میں تسامح کی تردید

مفتی صاحب نے اپنے اُنہی بنیادی امور کے پیشِ نظر جس پر فتویٰ کا مدار ہے فتاویٰ رحیمیہ کے فتویٰ میں مسامحت کی تعیین کی ہے۔ مگر بنیاد جب خود ہی مخدوش اور نقل کے خلاف ہے تو حضرت مفتی سید عبدالرحیم صاحبؒ کے فتویٰ کو مبنی بر تسامح کہنا کیسے صحیح ہوسکتا ہے۔

لان الظاهر من الفتوی ان السوال عن المسلم الحر الغنی المقیم فالاضحیة وجبت علیه ای فی ذمته بوجود الغنٰی الشرعی الذی هو علّة لنفس الوجوب ای لما

هو مقابل لوجوب الاداء وهو الشرط الاول فالغنا شرط فی المرتبة الاولی والوقت بعد ذلك شرطٌ للاداء ای لذبح الاضحیة سواء کان الذابح فی المصر او فی مکان لایصلی فیه العید وعینُ ذلك الوقت سبب لوجوب الاداء هذا هو الشرط الثانی ولافرق بین شرطیّة الوقت وسببیّته لانه جامع لهما باعتبارین (کمامر) ثم بعد ذلك ای بعد مجئ الوقت ینتظر لصحة ذبح الاضحیة الانصراف عن صلاة العید ان تذبح فی المصر وهذا الشرط خاص للمصر فقط وهو الشرط الثالث فاعتبار الوقت لمکان ذبح الاضحیة متعلق بشرط الاداء العام الشامل للمصری والقروی لاللشرط الثالث.

واذا علمت هذا فاستمع ان الشیخ المؤقر المفتی السید عبدالرحیم اللاجفوری نور اللّٰه ضریحه قد اجاب السائل المقیم فی حیدرآباد عن اخیه عبدالرشید الساکن فی بلدة مدراس فنفس الوجوب قد تحقق اذا ماصار ذا غنیً وبعد الوجوب یلاحظ وجوب الاداء المختص بالوقت وهو الشرط للاداء فالعبارات الفقیة المندرجة فی الجواب من الهدایة والدر المختار ورد المُحتار) لاعتبار مکان الاضحیة کلها متعلقة لهذا الشرط فلم یقع تقدیم و تاخیر من صاحب السمو الشیخ الفقیه اللاجفوری علی ما یزعم المفتی شبیر احمد المراد آبادی بل الامر اختلط علیه.

واذا کان کذلك فالسائل اذا ذبح فی مقامه فی یوم النحر اضحیة اخیه الساکن فی مدراس کان الذبح بعد سبب الوجوب ای سبب وجوب الاداء لان السبب هو الجزء السابق المتصل بالاداء کما قرره الفقهاء فلا یقع الذبح قبل سبب الوجوب علی ماقیل فالفتوی صحیح وصواب بالتحقیق لاتسامح فیه مطابق لما صرح به ائمة الفقه فی کتبهم.

جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کا فتویٰ

جدید موقف کی حمایت میں مذکورہ فتاویٰ کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل گجرات سے بھی اک طویل فتویٰ صادر ہوا جس میں مسئلۂ ہذا مختلف فیہا کو دوسرے طرز سے سمجھایا گیا ہے۔ مگر خاکم بدہن بنیادی تسامحات یہاں بھی درآمد ہوگئی ہیں تجاوز اللّٰه عن عثراتهم.

پس ادب کے ساتھ عرض ہے کہ سببِ وجوبِ اضحیہ کو سببِ وجوب للزکوٰۃ پر قیاس کر کے

(کہ دونوں مالی عبادت ہیں اور دونوں جگہ سبب کا لفظ موجود ہے) اضحیہ کے سبب کو مؤثر فی الوجوب تسلیم کیا گیا۔ یہ پہلا مقدمہ ہوا اور چونکہ سبب وجوب اضحیہ کو فقہ میں سبب وجوب للصلاۃ سے تشبیہ دی گئی ہے (کہ دونوں قربت موقتہ ہیں) اور نماز میں وجوب میں مکلّف کے وقت کا اعتبار ہے۔ یہ ہوا دوسرا مقدمہ پس قربانی کے متعلق کہا گیا کہ جب تک وقت خاص نہ آجائے غنی کا ذمہ مشغول بالواجب ہوگا ہی نہیں لہٰذا من علیہ الاضحیہ کے حق میں وقت کا اعتبار ضروری ٹھہرا۔ مگر مقدمۂ اولیٰ میں زکوٰۃ کا سبب وجوب ملک نصاب ہے جو کہ صفتِ مکلّف اور علّت ہے اور قربانی کا سبب وجوب یعنی وقت ادا، کا ظرف اور سبب محض ہے۔ اور مقدمہ ثانیہ میں قربانی کے وجوب کا محل جانور ہے اور نماز میں وجوب کا محل خود مکلّف کی ذات ہے اور دونوں جگہ وجوب سے وجوبِ ادا، مراد ہے هذا هو الفرق فيما بين المقدمتين.

اور حيلة المصرى اذا اراد التعجيل الخ کے متعلق فتویٰ ہذا میں جو کچھ مرقوم ہے رسالہ کے اخیر میں "المعتبر مكان الاضحيه" پر جو کلام کیا گیا ہے اس سے حقیقت آشکارہ ہوجائیگی۔

جدید موقف کی فاحش خطاء

(۹) اس سلسلہ کے فتاویٰ میں وقت ہی کو مؤثر فی الوجوب مان کر ابتداء وقت کے بارے میں یہ کہا گیا کہ من علیہ الاضحیہ کے اعتبار سے جب تک صبح صادق نہ ہوجائے اس کی قربانی دوسرے علاقہ میں کرنا جائز نہیں ہے اگرچہ وکیل ذابح کے یہاں وقت ہوچکا ہو ورنہ قربانی نہیں ہوگی۔ اس حکم کے ساتھ اگر یہ بھی کہا جاتا کہ من علیہ الاضحیہ کے یہاں وقت ختم ہوجانے پر بھی دوسرے مقام میں نیابۃً اس کی قربانی جائز نہ ہوگی چاہے مکان اضحیہ میں وقت موجود ہو تو ان کے اصول مفروضہ کے مطابق صحیح ہوتا مگر یہاں انتہائے وقت میں یوں کہا جارہا ہے "دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کسی شخص کے ذمہ قربانی واجب ہوجانے کے بعد اس کی ادائیگی جائز اور صحیح ہونے کے لیے جس جگہ میں قربانی کا جانور ہو وہاں قربانی کا وقت شروع ہوجانے کے بعد باقی رہنا ضروری ہے چاہے اصل مالک (مؤکل) کے مقام پر قربانی کا وقت ختم ہوگیا ہو" (ترجمۂ فتویٰ بزبان گجراتی از مفتی عمر فاروق لندن)

حالانکہ وقت کو جب مؤثر فی الوجوب (یعنی سبب وجوب فی معنی العلۃ) تسلیم کرکے من علیہ الاضحیہ کے حق میں اول وقت کا اعتبار ضروری قرار دیا گیا ہے تو لامحالہ آخر وقت میں بھی اسکا اعتبار ہوگا کیونکہ نیابۃً قربانی کے دوسرے مقام پر صحیح ہونے کے لیے جب یہ کہا جارہا ہے کہ پہلے

مؤکل کا ذمہ مشغول بالواجب ہونا چاہیے اس لیے کہ ادا، بغیر وجوب کے صحیح نہیں (اور ذمہ مشغول بالواجب ہوتا ہے وقت کی آمد پر نہ کہ اس سے پہلے۔ کما فی البلاغ والنداء وغیرہما) تو پھر بندہ بھی کہتا ہے کہ نیابۃً قربانی کے صحیح ہونے کے لیے مؤکل (من علیہ الاضحیہ کے اصل وجوب کا باقی رہنا بھی ضروری ہے پس جب مؤکل کے اعتبار سے وقت ختم ہوگیا تو نفس وجوب ہی ختم ہوگیا تو پھر ادا، کے صحیح ہونے کا کیا معنی۔ جیسے وجوبِ زکوٰۃ کے لیے ملک نصاب کو سبب وجوب کہا گیا ہے تو بقائے زکوٰۃ کے لیے نصاب کا باقی رہنا شرط ہے اگر ادا، سے پہلے نصاب ہلاک ہوگیا تو زکوٰۃ ساقط ہوجائے گی کیونکہ ملک نصاب سے اصل وجوب ثابت ہوتا ہے لہٰذا سبب وجوب ختم تو نفس وجوب بھی ختم۔ غالباً اسی وجہ سے حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہ العالی نے تائیدی خط میں یہ جملہ لکھا ہے ''نیز احتیاط اس میں ہے کہ جب قربانی کسی ملک میں کی جائے تو جس شخص کی طرف سے قربانی کی جارہی ہے اس کے ملک میں بھی ایام اضحیہ ختم نہ ہوئے ہوں۔''

مگر ''احتیاط'' کا لفظ پھر بھی تسامح سے خالی نہیں کیونکہ من علیہ الاضحیہ کے اعتبار سے وقت ختم ہوجانے کے بعد مکان اضحیہ میں قربانی جائز ہوتی تو احتیاط تھا کہ ان کے وقت ختم ہونے سے پہلے کرلی جائے۔ یہاں تو اصول مفروضہ کے مطابق قربانی بعد از وقت درست ہے ہی نہیں۔

اس طرح کا مسئلہ مفتی اسماعیل صاحب بھڑکودروی دامت برکاتہم کے شائع کردہ فتویٰ میں بھی ہے۔

مسئلہ نمبر۴: سعودی اور یو. کے جیسے ملک میں عید عموماً یہاں (ہندوستان) سے ایک دن پہلے ہوتی ہے اس لیے وہاں کے باشندے کی قربانی یہاں کی دسویں، گیارہویں اور بارہویں ذی الحجہ کے غروب آفتاب تک کرنی جائز ہے البتہ احتیاطاً ان کی قربانی پہلے دودن (یعنی دسویں، گیارہویں) میں کرلینی چاہئے تاکہ وہاں کے ایام قربانی پورا ہونے سے پہلے ان کی قربانی ادا ہوجائے۔ (ترجمہ از فتویٰ بزبان گجراتی مجلس الفقہ الاسلامی گجرات)

پس فتاویٰ کا یہ دوسرا طرف خود ان کے اپنے مفروضہ کے بھی خلاف ہے اس لیے کہ ابتدائے وقت میں من علیہ الاضحیہ کا اعتبار اور انتہاء میں مکان اضحیہ کا اعتبار کیا گیا ولم یقل احد بصحة اداء الموقتات بعد مضی وقتها... فان التضحية اراقة الدم وهی انما تقبل فی وقت الاداء لا بعده وانما الذی یلزم بعده قضاء ها (فتح القدیر: ۵۰۷/۹)

واما بعد مضی ایام النحر فقد سقط معنی التقرب باراقة الدم لانها لاتکون قربة

الا فی مکان مخصوص وھو الحرم او فی زمان مخصوص وھو ایام النحر ولکن یلزم التصدق بقیمة الاضحیة اذا کان ممن تجب علیه الاضحیة لان تقربه فی ایام النحرکان باعتبار المالیة فیبقی بعد مضیھا والتقرب بالمال فی غیر ایام النحر یکون بالتصدق (مبسوط:۱۲/۱٤)

جدید موقف کا مفسدۂ عظیم

(۱) وقتِ خاص ''سببِ وجوبِ ادا'' ہے اور ادا کا جو محل ہوگا وقت کا اعتبار اس کے حق میں کیا جائے گا جو مسئلہ زیر بحث میں اضحیہ ہے اس ضابطہ کے رُو سے عمل میں امت کے لیے یسر وسہولت ہے۔اس کے برخلاف ''سبب وجوب'' کے لفظ سے وقت کو ذمہ کے مشغول بالواجب ہونے کا مؤثر سبب ماننے کے نتیجہ میں جو علمی خطائیں واقع ہوئی ہیں ان میں سے اکثر پر آپ گذشتہ صفحات میں مطلع ہو چکے ہیں اور اب اخیر میں اس جدید موقف کے عملی پہلو میں امت کس قدر حرج وتنگی اور پریشانی میں مبتلا ہوجائے گی اسے بھی ایک نظر دیکھ لیجئے۔کیونکہ ایک طرف یہ مسئلہ فقط مغربی ممالک کی قربانیاں مشرقی ملکوں میں انجام دینے کا نہیں ہے بلکہ دنیا کے تمام شہروں اور دیہاتوں میں نیز ایک جگہ کی قربانی دوسری جگہ کرنے سے متعلق ہے۔اور دوسری طرف شمسی اوقات کے اعتبار سے ملک کے صوبوں اور صوبہ کے ضلعوں میں صبح صادق اور غروب آفتاب وغیرہ کے اوقات میں تفاوت (تقدم وتأخر) ہونا بالکل مسلّم اور قطعی ہے مثلاً امسال ۱۴۲۶ھ کی دسویں ذی الحجہ (یوم النحر) ۱۱رجنوری ۲۰۰۶ء کو پڑ رہی ہے اس دن کے صبح صادق کے اوقات میں علاقوں کا فرق بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیے۔

نوٹ : یہ مضمون اسی سال عیدالاضحیٰ سے قبل لکھا گیا ہے۔

صوبۂ گجرات

علاقہ	۱۱رجنوری	صبح صادق	علاقہ	۱۱رجنوری	صبح صادق
واپی دمن	//	۵-۵۷	سورت	//	۶-۰۰
احمد آباد	//	۶-۰۳	پٹن	//	۶-۰۶
بھوج	//	۶-۱۵	اوکھا	//	۶-۱۶

اسی طرح دیگر صوبوں کے مختلف حصوں کے اوقاتِ صبح صادق معلوم کیے جائیں تو تفاوت ضرور ظاہر ہوگا اور شریعت نے قربانی صحیح ہونے کے لیے دسویں کی صبح صادق سے لے کر۱۲ویں کے غروب آفتاب تک وقت کی تحدید کی ہے نہ صبح صادق سے قبل جائز اور نہ غروب آفتاب کے بعد جائز۔

لاتجوز التضحية فی الليلة العاشرة من ذی الحجة لانها تضحية قبل الوقت (قاضيخان على هامش العالمگيری:۳/۳٤٥)

ولم يقل احد بصحة اداء الموقتات بعد مضی وقتها. الخ (فتح القدير) اورایک جگہ کی قربانی دوسری جگہ شرعاً وفقہاً دونوں اعتبار سے درست ہے پس اگر پٹن یا بھوج کے کسی غنی نے واپی یا سورت کے کسی دیہات مثلاً اٹالوہ یا تراج میں کہ یہاں شرعاً نماز عید نہیں ہے قربانی کرائی اور وکیل نے صبح صادق کے فوراً بعد ذبح کیا تو ائمہ فقہ کی تصریح کے مطابق یہ قربانی شرعاً صحیح کہلائے گی اور جدید موقف کے اعتبار سے قربانی نہیں ہوئی کیونکہ من علیہ الاضحیہ مقیم پٹن وبھوج پر ۰۶-۶اور۱۵-۶ سے پہلے وجوب ہی نہیں ہوا، لہٰذا ذبح قبل الوقت ہوا۔

ہندوستان

علاقہ	۱۱رجنوری	صبح صادق	علاقہ	۱۱رجنوری	صبح صادق
دہلی (دارالسلطنت)	//	۵-۵۲	کلکتہ (مغربی بنگال)	//	۴-۵۹
بمبئی (مہاراشٹر)	//	۵-۵۶	ڈوبروگڑھ (آسام)	//	۴-۳۹
سری نگر (کشمیر)	//	۶-۰۸	پٹنہ (بہار)	//	۵-۱۶
بیکانیر (راجستھان)		۶-۱۱	مدراس (تامل ناڈو)		۵-۱۹
لدھیانہ (پنجاب)		۶-۰۰	کٹک (اڑیسہ)		۵-۰۵
احمد آباد (گجرات)		۶-۰۳	لکھنؤ (یوپی)		۵-۳۵

(یہ سب ٹائم ٹیبل ''اوقات الصلوٰۃ'' برائے ہندوستان مرتبہ محمد انس سے ماخوذ ہے ایک دو منٹ کا فرق ممکن ہے)

پس دہلی والوں کی قربانی مثلاً اطراف کلکتہ کے کسی دیہات میں یا بمبئی والوں کی قربانی مدراس کے دیہات میں بلکہ اہل گجرات کی قربانی بہار، بنگال اور آسام کے دیہاتوں میں طلوع صبح صادق کے فوراً بعد فقہاء کے بیان کے مطابق بالکل درست ہے اور نئے فتاویٰ کے رُو سے قطعاً جائز نہیں ہے۔

یہ منقسم ہندوستان کا حال ہے پاکستان و بنگلہ دیش ہی نہیں بلکہ ہر ملک کے اندرونی علاقوں میں قرب و بعد مسافت کی وجہ سے شمسی اوقات میں فرق یقینی ہے۔

اب ملکوں کا بھی اندازہ لگا لیجئے۔

افریقہ، امریکہ، برطانیہ، وغیرہ اور ممالک عربیہ کے مالداروں کی قربانیوں کا سلسلہ ہندو پاک اور بنگال وغیرہ ایشیائی وغیر ایشیائی ملکوں میں حضرت مفتی سید عبدالرحیم صاحب رحمہ اللہ کے فتویٰ کے بعد سے نہیں بلکہ ایک زمانۂ قدیم سے جاری اور لوگوں میں رائج ہے پس اہل مغرب کی طرف سے مشرقی ملک کے کسی دیہات میں بلکہ شہر میں رہنے والا غریب یا مالدار، شناسا یا غیر شناسا، براہ راست یا بالواسطہ جو قربانی کا وکیل ہوتا ہے اوّلاً تو اسے یہی نہیں معلوم کہ جس کی طرف سے قربانی ہے وہ کون اور کہاں رہتا ہے؟ اگر اجمالاً معلوم ہو تو اسے یہ علم نہیں ہوتا ہے کہ من علیہ الاضحیہ سے میں (وکیل ذابح) جہاں رہتا ہوں دونوں مقامات میں دن یا گھنٹوں کا کتنا فرق ہے اور اگر ملکی پیمانہ پر فرق (یعنی معیاری وقت) معلوم بھی ہو تب بھی مقامی وقت (شمسی رفتار) کے لحاظ سے من علیہ الاضحیہ کے یہاں صبح صادق وغیرہ اوقات کا واقعی علم نہیں ہوتا ایسی صورت میں وکیل ذابح کے لیے وقت کا صحیح اندازہ لگانا اور پھر اس کی رعایت کرنا کہ من علیہ الاضحیہ کے یہاں صبح صادق ہو چکی ہے یا نہیں یقیناً دشوار اور مشکل ہے۔

وکیل اگر شہر میں ہے تو وہ اتنا جانتا ہے کہ نماز عید کے بعد قربانی درست ہے اس سے قبل نہیں اور اگر دیہات میں ہے تو صبح صادق کے بعد قربانی کر سکتے ہیں۔ عامۃ المسلمین جتنا جان رہے ہیں بس یہی شرعاً ثابت ہے اور اگر من علیہ الاضحیہ کے اعتبار سے وقت کی رعایت کرنا ضروری ہو جیسا کہ جدید موقف کا تقاضہ ہے تو اتنا ہی نہیں کہ شہری کی قربانی دیہات میں صبح صادق کے بعد بلکہ ایک شہری کی قربانی دوسرے شہر میں نماز عید کے بعد بھی جائز نہ ہو مثلاً ایک مکی شخص نے اپنی قربانی سورت میں کرائی وکیل شہر میں نماز عید کے فوراً بعد ذبح کرتا ہے تو رؤیت ہلال کی بنیاد پر عرب اور ہند کی تاریخ ایک ہو جانے کے باوجود قربانی صحیح نہیں ہو سکتی اس لیے کہ شمسی وقت کے لحاظ سے مکی شخص (من علیہ الاضحیہ) کے یہاں ابھی صبح صادق نہیں ہوئی ہے اور یہاں سورت میں لوگ نماز عید سے فارغ ہو کر جانور ذبح کر رہے ہیں۔

غرضیکہ دنیا کے مختلف خطوں میں اور ملک کے مختلف حصوں میں لوگ وکالت و نیابت میں دوسروں کی قربانی کرتے ہیں ان کے لیے من علیہ الاضحیہ کے اعتبار سے صبح صادق کا لحاظ رکھنے میں

کھلم کھلا حرج ہے اور یہ مفسدۂ عظیم جدید موقف کا نتیجہ کہلائے گا۔

موقفِ حادث سے ایک متواتر عمل کا بُطلان

جدید موقف کا دوسرا نتیجہ جیسا کہ مفتی شبیر احمد صاحب نے نئے ضابطہ کی تفہیم کے لیے بطورِ مثال ذکر کیا اور مفتی اسماعیل صاحب بھڑکودروی نے مسئلہ کے طور پر ذکر کیا ہے۔

''مسئلہ ۶ یہاں ہندوستان میں رہنے والے بھائیوں کی قربانی سعودی اور یو، کے میں وہاں کی دسویں ذی الحجہ کو جائز نہیں اس لیے کہ یہاں کے باشندہ پر نویں ذی الحجہ ہونے کی وجہ سے ابھی قربانی واجب نہیں ہوئی ہے۔'' (ترجمۂ فتویٰ از مفتی اسماعیل بھڑکودروی مجلس الفقہ الاسلامی گجرات) اور باقی حضرات بھی التزاماً اسی کے قائل ہیں۔

مگر حقیقت میں یہ اُس جدید موقف کا دوسرا مفسدہ ہے کہ اس سے اطرافِ عالم سے ہدی یا رقم بھیج کر حرم میں کی جانے والی قربانیوں کا ایک سلسلہ جو خیر القرون سے عملاً چلا آرہا ہے جبکہ قربانی کرانے والے وہ لوگ بھی ہیں جو دنیا کے مختلف خطوں میں مقیم رہتے ہیں اُن کے اور حرم میں ذبح کے وقت میں کثیر تفاوت پایا جاتا ہے اور عموماً تاریخ کا بھی فرق رہتا ہے تو امت کے اس قدر مشترک متواتر عمل کا باطل ہونا لازم آرہا ہے جبکہ اصول شرع کی روشنی میں امت کا یہ عمل بالکل برحق ہے اور اس کے صحیح اور منقول ہونے پر کتبِ فقہ وتاریخ کی شہادت کافی ہے جیسا کہ آخری رسالہ میں آپ مطلع ہوں گے۔

پس اس نئے موقف کا اصولِ فقہ کے خلاف بلکہ خود اپنے مفروضہ کے خلاف ہونے، امتِ مسلمہ کا حرجِ بیّن میں مبتلا ہونے اور ایک متواتر عمل کے باطل ہونے کی وجہوں سے جدید موقف کا غلط ہونا بالکل عیاں ہوجاتا ہے۔ فتفکروا.

کشف الغطاء عن اعتبار الوقت لمحل الاداء

ایامِ قمری اور اوقاتِ شمسی

عبادتوں کی ادائیگی کے لیے ایام کی تعیین اور اوقات کی تحدید بھی کی گئی ہے تاریخ کی تعیین شریعتِ مطہرہ میں قمری اعتبار سے ہے اور اوقات کی تحدید وتقدیر شمسی اعتبار سے ہے ماہِ قمری کے ثبوت کا دارومدار رویتِ ہلال پر ہے اور حسبِ اختلاف یعنی خواہ مطلع متحد ہو یا مختلف چاند دیکھنے

والوں کے حق میں مطلع صاف ہونے نہ ہونے کی وجہ سے بعض ممالک اور بعض شہروں میں رُویتِ ہلال کا تحقق ہوتا ہے اور دیگر بعض مقامات پر اس کا شرعی ثبوت نہ بہم پہنچے اسلئے تاریخ میں ایک یوم کا فرق آجانا ممکن بلکہ واقع اور مسلّم ہے۔

مقامی وقت یعنی آفتاب کی ذاتی طبعی رفتار سے صبح صادق، طلوع، زوال، غروب وغیرہ کے ذریعہ وقت میں امتیازات قائم ہونے سے مخصوص اوقات کا تحقق ہوتا ہے اور آبادیوں میں ان کے جائے وقوع کے طول البلد وعرض البلد کے اختلاف سے اوقات مخصوصہ میں تفاوت بدیہی ویقینی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کے مختلف خطوں میں ایک دن میں گھنٹوں کا فرق بلکہ لیل ونہار کا بھی اختلاف رہا کرتا ہے۔

موقتات میں ایام واوقات کا اعتبار

لہٰذا اگر ہفت اقلیم میں اتحاد مطلع کی بنیاد پر قمری تاریخ یکساں ہو، تب بھی اوقات مخصوصہ میں تقدم وتأخر امرِ لابدی ہے اسی لیے فرضیتِ احکام میں دونوں امورِ قطعی کا اعتبار کیا گیا اور شرع نے عبادتوں کی ادائیگی کا مکلّف کرنے میں حسبِ وعدۂ خداوندی یرید اللّٰہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر اور لا یکلف اللّٰہ نفسا الا وسعھا. بندوں کی قدرت علی الادار کی بھی رعایت کی ہے یعنی شارع کا بندوں سے ادار کا مطالبہ ان کے اعتبار سے اوقاتِ مخصوصہ میں ہوا کرتا ہے۔ دیکھئے قرآن پاک کی آیت ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتابا موقوتاً.

اس آیت کے تحت امام رازیؒ لکھتے ہیں واعلم انہ تعالیٰ بیّن فی ھذہ الآیۃ ان وجوب الصلاۃ مقدر باوقات مخصوصۃ الّا انہ تعالٰی اجمل ذکر الاوقات ھھنا وبیّنھا فی سائر الآیات (تفسیر کبیر: ۲۸/۱۱) امام قرطبیؒ لکھتے ہیں... وقال زید بن اسلمؒ موقوتاً منجّمًا ای تؤدّونھا فی انجمھا والمعنی عند اھل اللغۃ مفروض لوقت بعینہ (تفسیر قرطبی: ۳۷٤/٥) اور قاضی بیضاویؒ لکھتے ہیں ای فُرِضَ محدود الاوقات لایجوز اخراجھا عن اوقاتھا فی شیء من الاحوال (تفسیر بیضاوی: ٤۰۲/۳)

ان سب کا حاصل حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی جامع تفسیر ''بیان القرآن'' کے ترجمہ وتفسیر کے مختصر دو جملوں سے ملاحظہ فرمائیے ''یقیناً نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے (پس فرض ہونے کی وجہ سے ادا کرنا ضرور اور موقت ہونے کی وجہ سے

وقت ہی پر ادا کرنا ضرور۔'' (بیان القرآن: ۱۵۳)

پہلے جملہ میں ''ادا کرنا'' ادار وقضا دونوں کو شامل ہے اور دوسرے جملہ میں ''ادا کرنا'' سے مراد ادا یعنی قضا کا مقابل ہے۔

الغرض واجباتِ موقتہ بلکہ قریبۃ غیر واجبہ بھی اگر شریعت نے اس کی ادار کو موقت قرار دیا ہے تو ادار یعنی فعل (واجب، نفل) کا جو محل ہوگا اس کے حق میں وقت کا اعتبار کیا جائے گا اور محلِ ادار جہاں ہوگا وہاں کا وقت ملحوظ ہوگا۔

(۱) نماز، روزہ یعنی ارکان مخصوصہ اور امساکِ مخصوص کا محل مکلّف کی ذات ہے یعنی فعل کا صدور اور قیام مکلّف کی ذات سے ہے اور چونکہ ان افعال سے اِتعابِ نفس مطلوب ہے اسی لیے یہاں نیابت بھی جائز نہیں لہٰذا فاعل یعنی مکلّف ہی کے حق میں وقتِ وجوب کا اعتبار ہوگا۔ پس اگر کوئی ہندی مثلاً بلغاریہ پہنچ جائے تو اس کے ذمہ عشار اور وتر کی ادار کا وجوب نہ ہوگا اور کوئی بلغاری شخص مثلاً عرب چلا جائے تو یہ دونوں نمازیں بھی واجب الادار ہوں گی۔ کیونکہ بلغاریہ میں عشار کا وقتِ ممتاز نہیں پایا جاتا ہے۔ اہلیتِ وجوب کے بعد ہی اوقات مخصوصہ میں متوجہ ہونے والے خطابِ شارع سے جس پر صیغۂ امر دال ہے ادار کا وجوب بھی مکلّف کے ہی ذمہ آتا ہے پس وقت کی وجہ سے ذمہ مشغول بالواجب ہوا لہٰذا فقہار کا "سببها اوقاتها" کہنا بالکل صحیح ہے۔

وسبب وجوبها اوقاتها والامر طلب لاداء ماوجب فی الذمة بسبب الوقت وقد ذكرنا وجه ذلك فی التقرير... فان قلت جعلت الوقت سببًا فكيف يكون شرطا قلتُ هو سبب للوجوب وشرطٌ للاداء. (عنايه على هامش الفتح: ۲۱۶/۱)

مگر یہ وجوب باعتبارِ محلِ ادار کے ہے اور اصل وجوب مکلّف کے ذمہ باعتبار صفات کے ہے۔ فافهم فانه لطيف وانه مزلة الفهم.

(۲) اور زکوٰۃ میں جزءٌ من النصاب کی ادائیگی کا وجوب ہوتا ہے (جو کہ مال ہے) پس ادار کا محل مال ہے لہٰذا وجوبِ ادار کا تعلق مال سے ہوا اور مال من حیث الجنس محلِ ادار ہے نہ کہ بحیثیتِ نوع اور چونکہ مقصود تصدق سے سَدّ خلّة المحتاج ہے اسی وجہ سے نیابت فی الادار جائز ہے، لہٰذا ادائے زکوٰۃ محلِ مال کا لحاظ ہوگا چنانچہ جہاں مال ہو وہاں کے فقرار کو مقدم رکھا جاتا ہے اگرچہ زکوٰۃ کی ادائیگی موقت نہیں ہے مگر مکانِ محل ادار کی رعایت پائی جاتی ہے۔

(۳) اور صدقۃ الفطر میں جس فعل کا وجوب صبح یوم الفطر کو ہوتا ہے وہ درحقیقت ''اغنار'' ہے

اوراغناء کا تعلق ذمہ مکلّف سے ہے پس نماز، روزہ کی طرح مکانِ مودّی کے حق میں وقت کا اعتبار کیا جائے گا۔

(۴) اور قربانی میں اوقات مخصوصہ میں واجب ہونے والا فعل اراقۃ الدم ہے جس کا محل جانور ہے اس لئے ذبح اضحیہ کے حق میں وقت کا اعتبار کیا جائے گا یعنی جانور جہاں ہوگا وہاں کا وقت ملحوظ ہوگا خواہ ذابح خود من علیہ الاضحیہ ہو یا اس کی طرف سے وکیل و نائب۔ اور خواہ قربانی نفل ہو کہ واجب اور وجوب بشرط الغنا (من جانب اللہ) ہو یا بسبب النذر (من جانب العبد) ہو یا پھر شراءِ فقیر بنیۃ الاضحیہ ہو۔ کیونکہ وقت مطلق قربانی کے لیے شرط ادا ہے۔

یہ سب امور ائمۂ فقہ کے نزدیک بالکل مسلّم ہیں اور اس میں نقلاً کوئی اختلاف نہیں ہے۔

(۱) القربات الموقتة يعتبر وقتها فی حق فاعلها لا فی حق المفعول عنه (بدائع:۵/۷۳)

(۲) المعتبر فی الزكوٰة فقراء مكان المال وفی الوصية مكان الموصی وفی الفطرة مكان المودّی عند محمد وهو الاصح لان رءوسهم تبع لرأسه (طحطاوی:۷۲۲)

(۳) وصدقة الفطر بعد ماوجبت لاتسقط بموت المودّیٰ عنه بخلاف الزكوٰة فان الواجب هناك جزء من المال وبهلاكه يفوت محل الواجب وهنا الصدقة تجب فی ذمه المودّی فبموت المودَّی عنه لايفوت محل الواجب فلهذا لا يسقط. (مبسوط:۳/۱۰۸، هدايه:۱۹٤)

(٤) فيعتبر فی الاداء مكان المحل وهو المال لامكان الفاعل (ای من عليه الاضحية) اعتباراً بها بخلاف صدقة الفطر حيث يعتبر فيها مكان الفاعل لانها تتعلق فی الذمة والمال ليس بمحل لها (مبسوط:٦/٤٧٧)

ويعتبر مكان المذبوح لامكان المالك وفی صدقة الفطر يعتبر مكان المولیٰ لامكان العبيد (قاضی خان)

فيعتبر فی الصرف ای فی الاراقة مكان المحل ای المال لامكان الفاعل اعتبارًا بالزكوٰة بخلاف صدقة الفطر (فتح القدير)

المعتبر مكان الاضحية کا ضابطۂ عام

مسئلۂ قربانی میں مکانِ ذبح اضحیہ کے حق میں وقت کا اعتبار صاحب بدائع نے خوب

وضاحت وصراحت کے ساتھ مدلل لکھا ہے وانما یعتبر مکان الشاۃ لامکان من علیه هکذا ذکر محمد فی النوادر قال انما انظر الی محل الذبح ولا انظر الی موضع المذبوح عنه وهکذا روی الحسن عن ابی یوسف انه یعتبر مکان الذی یکون فیه الذبح ولا یعتبر المکان الذی یکون فیه المذبوح عنه وانما کان کذلك لان الذبح هو القربة فیعتبر مکان فعلها لامکان المفعول عنه (بدائع: ۵/۷٤)

القربات الموقتة یعتبر وقتها فی حق فاعلها لا فی حق المفعول عنه ایک شرعی قائدۂ کلیہ ہے بلکہ الموقتۃ کے عموم میں واجباتِ موقتہ اور موقتاتِ غیر واجبہ دونوں شامل ہیں چنانچہ حج جس پر فرض ہے جب وہ بنفس نفیس حج ادا کرے گا تو اسی کے حق میں ایام واوقات کا اعتبار ہوگا اور اگر معذور ہونے کی وجہ سے دوسرے کو بھیجا تو اس حاج عن الغیر کے حق میں اوقات کا لحاظ ہوتا ہے خواہ محجوج عنہ کے یہاں یوم عرفہ اور وقت وقوف شروع ہوگیا ہو یا نہیں (البتہ محجوج عنہ پر حج فرض ہونا ضروری ہے اور اس کی فرضیت استطاعت پر متحقق ہوجاتی ہے) یہی حال نفل حج کا ہے اس لیے کہ شرعاً وہ بھی موقت ہے۔ ٹھیک اسی طرح قربانی ہے واجب ہو کہ نفل اس کی ادا مقید بالوقت ہے (رہا وجوب فی الذمہ سو وہ غنا ویسار سے ہے) اور نماز، روزہ میں مکلّف ہی فاعل قربۃ ہے اس لیے اس کے حق میں اوقات ملحوظ ہوتے ہیں۔

لہٰذا مکانِ ذبحِ اضحیہ کا اعتبار جمیع مکلفین کے حق میں شہری ہوں یا دیہاتی مسلم الثبوت ضابطہ ہے جہاں عید کی نماز شرعاً ہو وہاں نمازِ عید کے بعد اور وہ تمام جگہیں جہاں شرعاً نماز عید نہیں ہے صبح صادق کے فوراً بعد احناف کے نزدیک قربانی جائز ہے خواہ ذبح کرنے والا من علیہ الاضحیہ بذات خود ہو یا اس کا وکیل ونائب۔

المعتبر فی ذلك مکان الاضحیة حتی لو کانت فی السواد والمضحی (ای من علیه الاضحیة) فی المصر یجوز وقت الفجر ولو کانت فی المصر والمضحّی فی السواد لایجوز الا بعد الصلاة لانها تسقط بالهلاك قبل مضی ایام النحر کالزکوٰة تسقط بهلاك النصاب فیعتبر فیها مکان المحل وهو المال لامکان الفاعل (من علیه الواجب) کالزکوة بخلاف صدقة الفطر حیث یعتبر فیها مکان (المودّی) لانها تتعلق به فی الذمة (شرح نقایه: ۲/۲٦۹)

تنبیہ (حیلة المصری) پر

پس کتب فقہیہ میں "حیلة المصری اذا اراد التعجیل الخ" جیسی عبارت مذکورہ بالا قاعدۂ شرعیہ (المعتبر مکان الاضحیة) پر متفرع ایک جزئی ہے یعنی اہل شہر کے لیے قربانی کا گوشت جلد حاصل کرنے کی ایک تدبیر ہے جو ان کے اپنے شہر ہی سے قریب کے دیہات اور قریہ میں ممکن ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا تو صحیح ہے کہ دونوں جگہ میں اضحیہ کا وقت شروع ہو چکا ہے لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ اہل شہر کے حق میں صبح صادق کے بعد نماز عید سے پہلے قربانی کے جواز کی بس یہی صورت ہے جو شہر سے قریب دیہات میں متحقق ہو سکتی ہے، ہرگز صحیح نہیں ہے کیونکہ وقت جواز ''شرط ادا'' میں دنیا کے تمام اہل شہر اور اہل قریہ یکساں شامل ہیں اور نمازِ عید سے فراغت کی شرطِ زائد صحتِ قربانی کے لیے مطلق شہر کے حق میں ہے جس میں عالم کے تمام شہر داخل ہیں اور صبح صادق کے فوراً بعد دیہات میں قربانی کے صحیح ہونے کے لیے دیہات کا شہر سے قریب ہونا شرط نہیں ہے۔ ودخول الوقت لایختلف فی حق اهل الامصار والقریٰ وانما یختلفون فی وجوب الصلاة فلیس علی اهل القریٰ صلاة العید الخ. کما مرّ (مبسوط:۱۰/۱۲) الحنفیة قالوا: یدخل وقت الاضحیه عند طلوع فجر یوم النحر... وهذا لایختلف فی ذاته بالنسبة لمن یضحی فی المصر او یضحی فی القریة لکن یشترط فی صحتها للمصری ان یکون الذبح بعد صلاة العید (الفقه علی مذاهب الاربعة)

مکانِ اضحیٰ و من علیہ الاضحیہ کا اتحاد و اختلاف

مکان اضحیہ اور من علیہ الاضحیہ کے اتحاد و اختلاف کی عقلاً پانچ اور حاصل تین صورتیں ہیں جسے فقہاء عموماً بیان کرتے ہیں:

(۱) دونوں کا مکان متحد ہو جس کی دو شکلیں ہیں ایک دونوں شہر میں ہیں تو چونکہ مکانِ ذبح شہر ہے نماز عید سے پہلے قربانی جائز نہیں۔ دوسری اور اگر دونوں دیہات میں ہیں تو بعد الصبح فوراً قربانی درست ہوگی خواہ ذابح خود مَن علیہ الاضحیۃ ہو یا شخص دیگر۔

اور اگر دونوں کا مکان مختلف ہے تو جوازِ تضحیہ کے لیے مکان اضحیہ کا اعتبار ہے نہ کہ من علیه یامن مِنه الاضحیه کا پس اتحاد کی صورت میں چونکہ کوئی اشکال نہیں ہے اس لئے المعتبر

مکان الاضحیۃ کا ضابطہ پیش کرنے کی حاجت نہیں آئی اور اختلاف کی صورتوں میں اشکال متوجہ ہوگا اس لیے ضابطہ بیان کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی چنانچہ

(۲) من علیہ الاضحیہ اگر شہر میں ہو اور اس کا جانور دیہات میں تو وکیل ذابح کے لیے صبح صادق کے بعد قربانی بالکل درست ہے خواہ اضحیہ واجب ہو کہ نافلہ اور من علیہ الاضحیہ یامَن مِنه الاضحیة کسی بھی شہر میں ہو۔

(۳) دوسری کے برعکس اضحیہ شہر میں ہے اور من علیہ الاضحیہ دیہات میں تو نماز عید سے قبل جائز نہیں۔ اختلافِ مکان کی صورتوں میں وکیل ذابح اور اصیل مذبوح عنہ کے درمیان قرب وبُعد مسافت سے جواز پر کوئی اثر واقع نہیں ہوتا ہے۔

اعلم هذا اذا كان من عليه الاضحيه فى المصر والشاة فى المصر (یہ پہلی صورت ہوئی) فان كان هو فى المصر والشاة فى الرستاق او فى موضع لايصلى فيه (یہ دوسری صورت ہوئی) وقد امر ان يضحوا عنه فضحّوا بها بعد طلوع الفجر قبل صلاة العيد فانها تجزيه وعلى عكسه لوكان هو فى الرستاق والشاة فى المصر (یہ تیسری صورت ہوئی) وقد امر ان يضحى عنه فضحّوا بها قبل صلاة العيد فانها لاتجزيه وانما يعتبر فى هذا مكان الشاة لامكان من عليه الخ (بدائع)

(۴) من علیہ الاضحیہ ایک قریہ میں ہو اور اسکا اضحیہ دوسرے قریہ میں (اس کا حکم نمبر۲ سے ظاہر ہے)

(۵) ایک شہر والے کی قربانی دوسرے شہر میں علی عکس الرابع اس کا حکم نمبر۳ سے معلوم ہو چکا ہے۔

اس آخری صورت میں حسن بن زیادؒ کا معمولی سا اختلاف اَولویت کا ہے اور وہ بھی ذبح فی المصر کی شرط زائد "فراغ عن الصلاة" کے حق میں نہ کہ اصل شرط میں۔

صاحب بدائع آگے لکھتے ہیں: وان الرجل فى مصر واهله فى مصر آخر فكتب اليهم ان يضحوا عنه روى عن ابى يوسف انه اعتبر مكان الذبيحة فقال ينبغى لهم ان لا يضحوا عنه حتى يصلى الامام الذى فيه اهله وان ضحوا عنه قبل ان يصلى لم يجز وهو قول محمد وقال حسن بن زياد انتظرت الصلاتين جميعًا وان شكوا فى وقت صلاة المصر الآخر لم يذبحوا حتى تزول الشمس فاذا زالت ذبحوا عنه. وجه قول الحسن ان فيما قلنا اعتبار الحالين حال الذبح وحال المذبوح عنه فكان اولٰى.

ولابی یوسف ومحمد ان القربة هو الذبح والقربات الموقتة یعتبر وقتها فی حق فاعلها لا فی حق المفعول عنه (بدائع: ۵/۷۳)

یعنی حسن بن زیادؒ فرماتے ہیں کہ مذبوح عنہ کے یہاں بھی نماز عید ہوچکی ہو اس کا لحاظ کرلیا جائے تو اولیٰ ہے کیونکہ اس میں دونوں کے حال کی رعایت ہے۔ گویا ابن زیادؒ کے نزدیک اس صورت خاص میں بھی مکان اضحیہ کے اعتبار سے قربانی بعد نماز عید جائز اور درست ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ ادائے قربت کے لیے اعتبارِ وقت کا ضابطہ سب کے نزدیک مسلّم اور متفق علیہ ہے مگر حسن بن زیادؒ اس ضابطہ پر درجۂ اولویّت میں مکانِ مذبوح عنہ کے اعتبار کا اضافہ کررہے ہیں اس کے بالمقابل صاحبینؒ نے اصول پر کوئی اضافہ کسی درجہ میں نہیں کیا اور اسی میں امت کے لیے سہولت ہے۔ چنانچہ امت کا عمل بھی صاحبینؒ کے قول کے مطابق ہے اور یہی مفتی بہ ہے۔

الغرض مذکورہ تمام صورتوں میں غور فرمایئے المعتبر مکان الاضحیة کا ضابطہ کارفرما ہے حالانکہ اختلاف کی صورتوں میں یہ عین ممکن ہے کہ مکان اضحیہ اور من علیہ الاضحیہ کے درمیان بُعدِ مسافت کی وجہ سے طلوع صبح صادق اور غروب آفتاب کے اوقات میں بیّن فرق ہو کیونکہ یہ نظام شمسی کے تحت ایک مسلّم حقیقت ہے پھر بھی صحت تضحیہ کے لیے ابتداء وانتہاءِ وقت میں مکان اضحیہ کا ہی اعتبار کیا گیا ہے لان الذبح هو القربة فیعتبر مکان فعلها لامکان المفعول عنه.

اسی ضابطہ کے ماتحت وہ جزئیہ ہے جو "حیلة المصری الخ" کے عنوان سے کتب فقہ میں مذکور ہے جس کی وضاحت گذر گئی۔

اراقۃ الدم کی انواعِ اربعہ

شریعت میں اراقۃ الدم کے ذریعہ قربت انجام دینے کی جتنی صورتیں ہیں ان کی زمان ومکان کے ساتھ اختصاص کے اعتبار سے چار قسمیں ہیں:

(۱) زمان ومکان دونوں کے ساتھ خاص ہو جیسے دمِ قران، ودمِ تمتع اور دمِ نفل اگر مفرد بالحج کرنا چاہے یعنی دمِ شکر ایامِ نحر اور حرم کے ساتھ مختص ہے۔

(۲) مکان یعنی حرم کے ساتھ خاص ہو زمان یعنی یوم النحر کے ساتھ خاص نہ ہو جیسے دمِ جنایات، دمِ احصار، دمِ کفارہ۔

(۳) ایام نحر کے ساتھ خاص ہو، مکان متعین نہ ہو جیسے اضحیہ خواہ واجب ہو کہ نفل۔

(۴) زمان ومکان دونوں کے ساتھ خاص نہ ہو جیسے دمِ نذر۔

ثم اعلم ان الدماء علی اربعة اوجهٍ منه ما یختص بالزمان والمکان وهو دم المتعة والقران ودم التطوع فی روایة القدوری ودم الاحصار عندهما (۲) ومنه ما یختص بالمکان دون الزمان وهو دم الجنایات ودم الاحصار عنده والتطوع فی روایة الاصل (۳) ومنه ما یختص بالزمان دون المکان وهو الاضحیة (٤) ومنه مالا یختص بالزمان ولا بالمکان وهو دم النذور عندهما وعند ابی یوسف دم النذور یتعین بالمکان. (تبیین الحقائق:۲/٤۳٤)

اس سے معلوم ہوا کہ دم قران وتمتع اور اضحیہ ایام نحر کے ساتھ خاص ہے اور دم شکر ہو کہ دم جنایت حرم کے ساتھ موقت ہے اور دم تطوع اور دمِ نذر مختلف فیہ ہے۔

(وخص ذبح هدی المتعة والقران بیوم النحر فقط والکل بالحرم لابفقیره) بیان لکون الهدی موقتا بالمکان سواء کان دم شکر او جنایة لما تقدم انه اسم لما یُهدی من النعم الی الحرم واما توقیته بالزمان فمخصوص بهدی المتعة والقران الخ (بحرالرائق:۳/۷۲)

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ان تمام اراقۃ میں ذبیحہ کے حق میں زمان یا مکان کا اعتبار کیا گیا ہے نہ کہ مذبوح عنہ کے زمان ومکان کا۔ پس اگر مذبوح عنہ کے اعتبار سے زمان ومکان کی رعایت ضروری ہوتی تو فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ اتنی اہم شرط کو نظر انداز نہ فرماتے۔

تیسری بات غور فرمایئے اِن قُربات میں جو اراقہ واجب ہے اس کے وجوب فی الذمہ کا سبب وہ صفت ہے جس سے مکلّف وقتی وعارضی طور پر متصف ہوا ہے یعنی قران، تمتع، احصار، قتل صید، جنایت، نذر اور غنا ویسار۔ اراقۃ الدم کے وجوب کی علّت کہیں بھی وقت خاص نہیں ہے۔

ابل اور بقر میں سات آدمیوں کی شرکت

اس قربت کی ادائیگی کے لیے محل اراقہ اگر بڑا جانور ہے تو اس میں سات آدمیوں کی شرکت جائز اور درست ہے خواہ قربت کی جہت مختلف ہو البتہ قربت کی نیت ہونا سب میں شرط ہے اگر کسی ایک نے بھی محض گوشت حاصل کرنے کا ارادہ کیا ہے تو کسی کی قربت ادا نہ ہوگی۔

سن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم البدنة عن سبعة والبقرة عن سبعة. (بدایة

المجتهد ٤/٨٤)

والابل والبقر تجزی عن سبعة والمعز والغنم لایجزیان الا عن احد وان کان بعض السبعة اهل المتعة وبعضهم اهل القِران وبعضهم اهل الجزاء وبعضهم اهل الاضحیة وبعضهم اهل التطوع اجزأت عنهم ولو کان بعضهم یرید نصیبه من اللحم فانه لایجوز ولا عن احد (النُتَف فی الفتاویٰ لابی الحسن علی السُغدی متوفی ٤٦١هـ)

ولو ارادوا القربة الاضحیة او غیرها من القرب اجزأهم سواء کانت القربة واجبة او تطوعا او وجبت علی البعض دون البعض سواء اتفقت جهات القربة او اختلفت بان اراد بعضهم الاضحیة وبعضهم جزاء الصید وبعضهم هدی الاحصار وبعضهم کفارة شیء اصابه فی احرامه وبعضهم هدی التطوع وبعضهم دم المتعة والقران... وهذا قول اصحابنا الثلثة (بدائع: ٥/٧١)

ذبح فی الحرم کے لیے ہدی یا رقم بھیجنے کا قدیم دستور

سوق الهدی معه افضل لانه صلی اللّٰه علیه وسلم ساق الهدایا مع نفسه. (هدایه)

رسولِ پاک ﷺ کا حجۃ الوداع میں مدینہ منورہ سے اپنے ساتھ سو(۱۰۰) یا ترسٹھ(۶۳) ہدی (اونٹ) کا لے چلنا اور یمن سے حضرت علیؓ کا ہدی لے کر آنا اور دیگر صحابہ کرام کا بھی اپنے اپنے علاقہ سے ہدی ساتھ لے جانا کتب حدیث میں موجود ہے حضور ﷺ اور بعض صحابہ قارن اور بہت سے صحابہ نے تمتع کا احرام باندھا تھا۔اور اسی بنیاد پر متمتع (اور قارن) کے لیے ہدی کا ساتھ لیجانا افضل ہے(حجۃ الوداع للشیخ الکاندھلویؒ) اور قران وتمتع آفاقی شخص ہی کے لیے خاص ہے جو دنیا کے ہر دور دراز علاقہ سے آتے ہیں (قرآن مجید) نیز قافلۂ حجاج عازمین بیت اللہ کی معرفت قربانی کا جانور یا اس کی رقم بھیجنے کا دستور بھی خیر القرون سے چلا آرہا ہے چونکہ آفاق سے ہدی بھیجنے والے اشخاص دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اس لیے ناموں کی تعیین کے ساتھ ان کے واقعات پیش کرنا چنداں آسان نہیں ہے اور یہ موضوع تاریخ کا ہے رجالِ حدیث علماء اسلام اور افرادِ امت کی سوانحِ زندگی کا بالتفصیل مطالعہ کیا جائے اور کم از کم حجاج کی حالاتِ زندگی اور ان کے سفرناموں کو پڑھ لیا جائے تو ضرور اس طرح کے جزوی بہت سے واقعات دستیاب ہوجائیں گے اور قدرِ مشترک امت کا یہ معمول بھی بخوبی معلوم ہوجائے گا اور اگر مکہ مکرمہ کے قدیم ادارے جہاں آفاق سے آئے ہوئے

بہت سے حجاج ان اداروں کے توسط سے قربانی وغیرہ کراتے ہیں ان اداروں نے اِس نوع کا کوئی دستاویز محفوظ رکھا ہوتو اِس قدیم دستور کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ من شاء فلیراجع.

یہاں اشارہ کے طور پر اعیان الحجاج سے دو واقعہ پیش کرتے ہیں۔ محدثِ کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ کے الفاظ میں:

اوّل: ''حضرت علقمہ'' نے متعدد حج کیے ہیں ایک بار وہ حج کو جانے لگے تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنی ہدی کے جانوران کے ساتھ کردیے اور فرمایا کہ ذبح کے بعد گوشت کے تین حصے کرنا ایک حصہ تم اور تمہارے ساتھی کھالیں اور ایک حصہ خیرات کردینا اور ایک حصہ میرے بھائی عتبہ کے پاس بھجوادینا۔ حضرت سفیانؒ نے فرمایا یہ نفل قربانی تھی'' (اعیان الحجاج: ١/٨٣، عن مجمع الزوائد للهيثمی)

دوم: ''شیخ سعدیؒ نے گلستاں میں ایک جگہ لکھا ہے ہمارے ساتھ حجاز جانے والے قافلہ میں ایک خرقہ پوش بزرگ بھی تھے ان کو عرب کے ایک امیر نے منیٰ میں قربانی کرنے کے لیے دوسو دینار دیے تھے جاتے جاتے ایک مقام پر قبیلہ بنوخفاجہ کے چوروں نے ہم پر چھاپہ مارا اور جتنا کچھ تھا سب لوٹ لے گئے۔'' (اعیان:٢/١٠٠)

نتائج تحقیق

(١) مذکورہ تحقیق وتنقیح سے معلوم ہوا کہ خیرالقرون سے اب تک سلف وخلف، متقدمین ومتأخرین، علماء وصالحین اور امت کے بے شمار عامۃ المسلمین نے جتنی قربانیاں کی ہیں یا کرائی ہیں یہ سب اصول شرع کے بالکل مطابق ہیں۔

(٢) اطرافِ عالم کے مختلف خطوں سے اللہ کے کچھ بندے حرم واہل حرم کی عظمت ومحبت میں توسع علی اهل الحرم کے جذبہ سے حجاج کی معرفت قربانی کا جانور یا اس کی رقم بھیج دیتے ہیں تاکہ ان کی طرف سے یوم النحر کو قربانی کی جائے ایسی تمام قربانیاں اصول شرعیہ کے ماتحت بالکل صحیح ہیں۔

(٣) قارن یا متمتع جو اپنے ساتھ دم قران وتمتع کے لیے بَدَنہ (اونٹ یا گائے) لے کر چلا اس آفاقی نے اپنے جانور میں اوروں کو بھی شریک کرلیا ان شرکاء میں بعض صاحب اضحیہ ہے، بعض صاحبِ احصار وغیرہ اور دم احصار اگرچہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دمِ شکر کی طرح ایامِ نحر کے ساتھ

خاص نہیں ہے لیکن یہ تو طے ہے کہ آفاقی کو احصار کہیں بھی پیش آسکتا ہے، پس اگر قارن یا متمتع نے اپنا مشترک جانور یوم النحر کو ذبح کیا تو اصول اور فقہ کی روشنی میں یہ ذبح عندالشرع درست ہے شرکاء اپنے اپنے واجب فی الذمہ سے سبکدوش ہوجائیں گے۔ محصر کا اپنے احرام سے نکلنا صحیح کہلائے گا۔ کیونکہ محصر کا احصار جو وجوبِ دم کا سبب ہے وہ کسی وقت خاص کے ساتھ موقت نہیں ہے۔ اسی طرح ملکِ نصاب کی وجہ سے ذمہ کا مشغول بالواجب ہونا مقید بیوم النحر نہیں ہے۔

پس اگر باوجود غنا کے غنی کا ذمہ مشغول بالواجب نہیں ہوا بلکہ وقت آنے پر ہی صاحب ذمہ بنے گا تو اتنی صدیوں میں بہت سی واجب قربانیاں جدید موقف کے مطابق جو من علیہ الاضحیہ کے اعتبار سے قبل از وقت یا بعد از وقت بھی کی گئی ہوں گی وہ سب رائیگاں ٹھہریں اور اشتراک والی صورت میں نہ دم احصار ادا ہوا اور نہ ہی دم جنایت اور نہ ہی تمتع وقران کا واجب دم صحیح کہلایا کیونکہ اراقہ فعل واحد ہے۔ ایک شریک کا بھی دم اگر ادا نہیں ہوا تو کسی کی طرف سے بھی اراقۃ الدم صحیح نہیں کہلائے گا لہٰذا وقت ہی سے اصل وجوب ماننے کا نظریہ مفاسد کثیرہ کو مستلزم ہے۔

خلاصۃ الکلام اور فتویٰ

سابقہ بحث ونظر اور تحقیق کا خلاصہ یہی ہے کہ ذبح اضحیہ کے سلسلہ میں خیر القرون سے چلا آرہا معمول عین شرع کے مطابق ہے یعنی المعتبر مکان الاضحیہ جہاں جانور ذبح کیا جاتا ہے وہاں ایام نحر کا ہونا ضروری ہے اور جن کی طرف سے قربانی ہے چاہے واجب یا نفل ان کے یہاں بھی وقت شروع ہو چکا ہو اس کی رعایت کرنا ائمہ مجتہدین سے منقول نہیں ہے اور من علیہ الاضحیہ پر قربانی مالک نصاب ہونے کی وجہ سے واجب ہوجاتی ہے یہی ہے حقیقت میں نفس وجوب جو غنا ویسار پر موقوف ہے۔ پس افریقہ، برطانیہ اور امریکہ وغیرہ ممالک مغربیہ کے باشندوں کی قربانی مشرقی ملکوں میں یہاں کے وقت کے اعتبار سے یا برصغیر کے باشندوں کی قربانی حرمین وغیرہ عرب ملکوں میں وہاں کے اوقات کے اعتبار سے شرع کے موافق اور تصریحات فقہیہ کے بالکل مطابق ہے وھذا ھوالمرام. وما علینا الا البلاغ واللّٰہ الموفق لما یحب ویرضی والصلاۃ والسلام علی حبیبہ المصطفیٰ.

❁ ❁ ❁